اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

مئی ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

کتاب	قیمت
ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۶۰۰
اسلامی سکول کے خدوخال	۱۵۰
تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۳۰۰
یکساں قومی نصاب۔خدشات ومضمرات	۲۵۰
تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ)	۵۰
تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ)	۵۰
پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ)	۵۰
ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیرطبع)	

طلبہ کی اسلامی تربیت

کتاب	قیمت
تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۲۵۰
تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ہینڈ بک وگائیڈ	۳۰۰

اصلاحِ دینی مدارس

کتاب	قیمت
ہمارا دینی نظام تعلیم	۴۵۰
نصابِ مدنی	۸۰
مدرسہ ڈسکورسز۔مطالعہ وتجزیہ	۲۵۰
اصلاحِ دینی مدارس	۴۰۰

اسلامی تحریکیں

کتاب	قیمت
پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۳۰۰
ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ)	۴۰
خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۵۰
عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۱۵۰

تزکیۂ نفس

کتاب	قیمت
اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۱۵۰۰
حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۸۰
اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۸۰
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۳۵۰
اسلام اور تعمیر سیرت (زیرطبع)	

مغربی فکروتہذیب

کتاب	قیمت
اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش	۳۵۰
اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۲۵۰
اسلام اور ردِ مغرب	۳۰۰

فہم دین

کتاب	قیمت
مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل	۴۷۵
مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۱۰۰۰
مقالاتِ امین (جلد دوم)	۱۰۰۰
شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۵۰

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

مندرجہ ذیل کتابوں کے کچھ نسخے ادارے میں دستیاب ہیں۔
خریدنے کے خواہش مند حضرات رابطہ فرمائیں:

ترکِ رذائل — احمد جاوید (مرتب: ڈاکٹر محمد امین)

صفحات: ۲۹۲ — قیمت: ۳۵۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً) — ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۶۲ — قیمت: ۸۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

تعلیمی ادارے اور کردار سازی — ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۱۷۲ — قیمت: ۲۰۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۵، مئی ۲۰۲۱ء/ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ

مشمولات

○تعلیم و تربیت

- قومی تعلیمی نصاب اور اقلیتوں کے اعتراضات ۴
- تعلیم، سیکولرزم اور اقلیتیں — پروفیسر ملک محمد حسین ۷
- سپریم کورٹ میں زیر سماعت کیس بسلسلہ نصاب و درسی کتب ۱۰
- پاکستان کے مستقبل کے خلاف ایک گھناؤنی سازش ۱۵
- یکساں قومی نصابِ تعلیم — ڈاکٹر حسین احمد پراچہ ۱۷
- ہر ریاست کا نصابِ تعلیم ۔ ریاست کے نظریہ پر مبنی ہوتا ہے — اوریا مقبول جان ۲۰
- اسلامی نصاب کے متعلق تشویش — انصار عباسی ۲۳
- نصاب تعلیم ایک بار پھر سازشوں کی زد میں — ڈاکٹر سمیرا ملک ۲۵

○اسلام اور پاکستان

- نیا اوقاف ایکٹ ۔ خلافِ شریعت و خلافِ آئین ہے — مفتی محمد تقی عثمانی ۲۸
- اسٹیبلشمنٹ اور تحریک لبیک — ڈاکٹر محمد امین ۳۶

○تفہیم دین

خاموش انقلاب ناگزیر ہے — مدیر ۴۰

○تزکیۂ نفس

- کیا اورادو اشغال بدعت اور خلافِ شریعت ہیں؟ — مولانا محمد منظور نعمانی ۴۶
- رمضان المبارک ہمیں بدلتا کیوں نہیں؟ — مدیر ۵۵

○تفہیم مغرب

مغربیات ۔ حسنِ عقیدت و تنقید — عبداللہ میر ۵۶

○استفسارات

اقامتِ دین کا مفہوم — مدیر ۵۷

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

انچارج سرکولیشن

(0309-4607124)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے

سالانہ 500 روپے۔ پانچ سال: 2000 روپے

تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

A/c # 02011478219

برائے رابطہ

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54700

ادارتی امور

ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف

0306-4640366

تعلیم و تربیت   پروفیسر ملک محمد حسین

قومی تعلیمی نصاب اور اقلیتوں کے اعتراضات

تعلیم کسی معاشرے کے عقائد، سماجی اقدار، تہذیب وثقافت اور روایات نئی نسل کو منتقل کرنے کا نام ہے۔ کسی مسلمان ملک اور مسلمان معاشرے کے عقائد، اس کی سماجی اقدار، اس کی تہذیب وثقافت اور اس کی روایات کی اساس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآن وسنت ہیں۔

نصابِ تعلیم اور اس پر مبنی درسی کتب تعلیم کے عمل میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بنیادی وسیلہ ہیں تعلیمی عمل کا اور ناگزیر ہتھیار ہیں معلم کے لیے جو تعلیم کے عمل کو لے کر چلتا ہے۔ نصاب اور درسی کتب اساتذہ کرام کا راہِ عمل اور روڈ میپ ہیں جن کے بغیر معاشرے کے عقائد، اس کی سماجی اقدار، اس کی تہذیب وثقافت اور اس کی روایات نئی نسل کو منتقل نہیں کی جاسکتیں۔

اب کچھ لبرل سیکولر افراد اور کسی ایک آدھ اقلیتی مذہب کے خود ساختہ دو چار نمائندے مطالبہ کرتے ہیں کہ چونکہ اقلیتی مذاہب کے بچوں نے بھی قومی نصاب اور اس کے مطابق لکھی گئی درسی کتب پڑھنی ہوتی ہیں اور دستور کے مطابق انہیں اپنے مذہب سے ہٹ کر درسی مواد پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اس لیے اسلامیات کے مضمون کے علاوہ دیگر مضامین خصوصاً اردو، انگریزی اور معاشرتی علوم کی درسی کتب میں اسلامی مواد نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اس مطالبے کا حقیقتِ حال کی روشنی میں ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا ۹۷ فیصد ہے جب کہ اقلیتیں تین فیصد ہیں اس تین فیصد آبادی میں تقریباً ایک فیصد قادیانی، ایک فیصد عیسائی اور ایک فیصد ہندو، سکھ، پارسی وغیرہ ہیں۔ قادیانی اگرچہ مسلمانوں کے نزدیک غیر مسلم ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں اس لیے انہیں تو درسی مواد میں اسلامی تصورات شامل کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں کی طرف سے درسی مواد میں اسلام کی شمولیت پر کبھی اعتراض نہیں رہا۔ عیسائیوں کا سوادِ اعظم بھی کبھی معترض نہیں رہا۔ صرف چند عیسائی ایکٹوسٹ

جنہوں نے این جی اوز بنا رکھی ہیں اور جنہیں مغربی ملکوں سے کثیر مالی امداد ملتی ہے۔ وہ مقامی لبرل سیکولر لابی سے مل کر شور مچاتے رہتے ہیں۔ اب یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ بیرونی امداد سے مالا مال چند افراد اقلیتوں کے نمائندے بن کر ملک کے ۹۷ فیصد مسلمانوں کے بچوں کو اپنے عقائد، اپنی سماجی اقدار، اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی روایات کی تعلیم سے محروم رکھنے کے لیے ڈکٹیٹ کرتے ہیں۔ ان چند افراد کی پشت پر یو این کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی، انٹرنیشنل کمیشن برائے ریلیجن اینڈ ڈیموکریسی ہیں جو امریکن حکومت کا دباؤ استعمال کر کے مسلمان ملکوں سے ان کی آئندہ نسلوں کے ذہن اپنے دین سے خالی کرانا چاہتے ہیں۔ جمہوریت اگر دنیا کا رول آف بزنس ہے اور دنیا کی تعلیمی روایات اگر کوئی حیثیت رکھتی ہیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور اگر کوئی اہمیت رکھتا ہے تو پاکستان کے قومی تعلیمی نصاب اور قومی درسی کتب میں اسلامی تصورات اور اسلامی اقدار کا تانے بانے کی حیثیت میں موجود ہونا از حد ضروری ہے۔ ایک اقلیتی گروہ کی اس قسم کی شرارت کو قوم بالکل برداشت نہیں کرے گی۔ وزارتِ تعلیم اور اعلیٰ عدالتوں کو بھی اس طرح کی نظریاتی شدت پسندی بلکہ دہشت گردی کے سامنے بند باندھنا چاہیے اور عدل وانصاف پر مبنی مسلم اکثریت کے بچوں کے تعلیمی حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے۔ اگر اس کے برعکس کچھ کیا گیا تو کسی کے بھی فائدے میں نہ ہوگا۔

قومی نصاب تعلیم پر ہمیں بھی اعتراضات ہیں اور وہ اعتراضات یہ ہیں کہ نیشنل کریکولم کونسل نے سنگل نیشنل کریکولم کے نام سے جو نصاب تعلیم ترتیب دیا ہے وہ ایک طرف تو ہمارے طلبہ کی ضروریات اور عصری تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ دوسری طرف بیرونی ایجنسیوں اور ان کے مقامی سیکولر لبرل گماشتوں کے دباؤ کے تحت اُسے بہت حد تک سیکولر ائیز کر دیا ہے، خصوصاً معاشرتی علوم کے مضمون میں جو اسلامی معاشرے کے بچوں کو پڑھانا ہے اس میں سے اسلامی تصورات خارج کر دیے گئے ہیں نیز اسلامی اقدار کو نصاب کے تانے بانے کا حصہ بنانے کی بجائے سیکولر، لبرل اور ہیومنسٹ اقدار مثلاً Freedom of, Diversity,Tolerance , Creativity, Democracy, Inclusion, Human Rights,Expression Critical Thinking,Equality وغیرہ وغیرہ کو نصاب اور درسی مواد کے تانے بانے میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ صرف اتنا کیا گیا ہے کہ اردو کی درسی کتب میں حمد اور نعت شروع میں دی گئی ہیں اور بعض کتابوں میں پیغمبر اسلام کی زندگی کے واقعات، بعض صحابہ کرام کا تذکرہ یا

امہات المؤمنین کا تذکرہ شاید کیا گیا ہے جس پر لبرل سیکولر لابی اور اقلیتوں کے خودساختہ نمائندے اعتراض کر رہے ہیں کہ درسی کتب میں اسلامی مواد شامل کیا گیا ہے اور اس طرح غیر مسلم طلبہ کو اسلامی مواد پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو پاکستان کے دستوری تقاضوں اور اقلیتوں کے حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو، انگریزی وغیرہ کی کتب کے درسی مواد میں نماز کے فرائض اور وضو کی سنتیں تو نہیں پڑھائی جا رہیں۔ حمد تو اللہ کی تعریف ہے اور اس پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ نعت اس دنیا کے عظیم انسان کی تعریف ہے تو غیر مسلموں کو اس کی کیوں تکلیف ہے؟ ویسے حمد و نعت تو لٹریچر کی صنف ہیں جن سے بچوں کی واقفیت ضروری ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ، صحابہ کرامؓ یا امہات المؤمنینؓ کا اگر کہیں تذکرہ ہے تو یہ تاریخ اور اخلاق و کردار سنوارنے کے لیے رول ماڈل زندگیوں کا تذکرہ ہے جیسے اردو انگریزی کی کتب میں دنیا کے دیگر معروف انسانوں، سائنسدانوں وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے تو سمجھ نہیں آتی کہ سیکولر لبرل لابی اور اقلیتوں کے خودساختہ نمائندوں کو اس سے کیا مسئلہ ہے؟ اگر ۹۷ فیصد مسلم آبادی والے ملک میں ان کی تاریخ اور ان کی تاریخی شخصیات کا ذکر نہیں ہوگا جن کی زندگیاں ان کے لیے رول ماڈل ہیں تو پھر اور کس کا ذکر ہونا چاہیے؟

چلیے مان لیتے ہیں کہ اقلیتوں کو شاید اعتراض ہوگا کہ درسی کتب میں اسلامی مواد نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ مواد ان کے بچوں کو نہ چاہتے ہوئے پڑھنا پڑتا ہے لیکن اس کی تصدیق کی جانی چاہیے اور اگر تصدیق ہو جائے تو اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے ان کے حق میں کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ہم تجویز کرتے ہیں کہ سکولوں میں جو غیر مسلم بچے پڑھتے ہیں (اگرچہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے) ان کے والدین سے ریفرنڈم کرالیا جائے۔ اگر اکثریت اس امر کی مخالفت کرے تو جمہوری قدروں کا خیال کرتے ہوئے ان کے بچوں کے لیے انہیں علیحدہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت دی جائے اور ان اداروں کی مالی معاونت حکومت کرے کہ ریاست کے شہری ہونے کی وجہ سے اقلیتوں کا یہ بنیادی حق ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جہاں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہوگا وہاں مسلمان اکثریتی آبادی کے بچوں کے تعلیمی حقوق کی پاسداری ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہو جائے تو تمام مضامین کی درسی کتب میں ضرورت کے مطابق زیادہ سے زیادہ اسلامی مواد شامل کیا جانا چاہیے۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیم، سیکولرزم اور اقلیتیں

تعلیم ہر ملک کے نظریۂ حیات، اس کی تہذیب وثقافت، اس کی قومی روایات اور عصری ضروریات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہر قوم اس امر کو یقینی بنانا چاہتی ہے کہ اس کی نئی نسل اپنی پرانی نسل کی تہذیب وثقافت کا تسلسل ہو۔ تعلیم میں نظریاتی اور تہذیبی تشخص اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس سے قومی یکجہتی اور قومی استحکام پیدا ہوتا ہے۔ قومی سوچ میں یک رنگی اور قومی امنگوں میں یک سمتی کا ظہور ہوتا ہے۔ اندرونی اور بیرونی مخالف قوتوں کا مقابلہ بھی قومی جذبہ پیدا کرنے سے ہوسکتا ہے جو تعلیم گاہوں کی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں کو لائحہ عمل نصاب اور درسی کتب سے ملتا ہے جسے اساتذہ کام میں لا کر نسلِ نو کی تربیت اور تہذیب کرتے ہیں۔

قوموں کی آبادی میں سو فیصد یکسانیت کبھی نہیں ہوتی۔ عام طور پر ایک اکثریتی گروہ ہوتا ہے اور کچھ اقلیتی دھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اقلیتی دھڑے مذہب کی بنیاد پر بھی ہوسکتے ہیں اور نسل، زبان یا رنگ کی بنیاد پر بھی۔ ان اقلیتی دھڑوں کے حقوق بھی ہوتے ہیں اور ان کی ضروریات کا خیال بھی رکھا جاتا ہے لیکن یہ سب کچھ اکثریتی گروہ کے حقوق اور ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ یہ حق وانصاف کے منافی اور جمہوری قدروں کے مطابق نہیں ہوگا کہ اقلیت، اکثریت پر حاوی ہوجائے یا اُسے ڈکٹیشن دینا شروع کردے۔

اب وطن عزیز پاکستان میں غالب آبادی مسلمانوں کی ہے جو ایک اندازے کے مطابق ۹۷ فیصد ہے جب کہ مذہبی اقلیتیں محض ۳ فیصد ہیں۔ ان تین فیصد اقلیتوں میں تقریباً ایک فیصد قادیانی ہیں۔ ایک فیصد عیسائی ہیں اور ایک فیصد باقی مذاہب یعنی ہندو، سکھ، پارسی وغیرہ ہیں۔ قومی نصاب تعلیم اور درسی کتب کے حوالے سے قادیانیوں کا کبھی کوئی ایشو نہیں رہا سوائے اس کے کہ ختم نبوت کا تصور اُجاگر کر کے بچوں کو پڑھایا جائے جو قادیانی عقائد کے خلاف ہے۔ اس ایشو پر وہ اور ان کے حامی چھپے وار تو کرتے ہیں لیکن کھلم کھلا اس کے خلاف نہیں بول سکتے۔ ہندو و سکھ

اور دیگر چھوٹی اقلیتوں نے تعلیم ، نصاب تعلیم اور درسی کتب کو کبھی اختلافی ایشو نہیں بنایا۔ بس عیسائیوں کے کچھ خودساختہ لیڈر ہیں جنہیں بعض مغربی ملکوں سے کھلی مالی امداد ملتی ہے۔ وہ اپنے آقایانِ ولی نعمت کی خوشنودی کی خاطر پاکستان کے نصاب کے مذہبی پہلو پر معترض رہتے ہیں۔ مغرب کا یہ تہذیبی ایجنڈا ہے کہ اسلام کو یا تو دنیا سے ختم کرنا ہے یا اتنا کمزور کرنا ہے کہ وہ مغربی تہذیب وثقافت کے لیے کوئی چیلنج نہ رہے۔ اس کے لیے وہ تعلیم ، نصاب تعلیم اور درسی کتب کو ہدف بناتے ہیں کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر مسلمان معاشروں کی نئی نسل کو اسلامی نظریہ حیات کی تعلیمات سے محروم کردیا جائے تو ان کی بالادستی کا راستہ صاف ہوجائے گا۔ اس ایشو پر امریکہ خاص طور پر سرگرم ہے جس نے باقاعدہ ادارے قائم کرر کھے ہیں جو اس ایشو پر کام کرتے ہیں۔ ایک ادارہ ہے 'یو ایس کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی' اور دوسرا ادارہ ہے 'انٹرنیشنل سنٹر فار ریلیجن اینڈ ڈیماکریسی'۔ یہ دونوں ادارے مسلمان ملکوں کے نصابات اور درسی کتب پر وسیع ریسرچ کرتے ہیں اور اپنے نتائج کی روشنی میں امریکی حکومت کو سفارشات پیش کرتے ہیں اور پھر امریکی حکومت مسلمان ملکوں میں اپنے گماشتوں کے ذریعے سے ان سفارشات کو عملی جامہ پہناتی ہے۔

پاکستان میں متعدد این جی اوز ہیں جن کی سربراہی اور فعال قیادت خودساختہ عیسائی لیڈروں کے پاس ہے یا ڈاکٹر ہود بھائی، اے ایچ نیر اور اسی طرح کے لبرل سیکولر خودساختہ ماہرین تعلیم کے پاس ہے۔ یہ لوگ ایک متحدہ لابی کے طور پر کام کرتے ہیں ۔ حکومتی حلقوں میں اثرورسوخ رکھتے ہیں، میڈیا میں ان کے سرپرست موجود ہیں اور ٹیڑھی زبانیں کرکے انگریزی بھی بول لیتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک ماحول پیدا کردیتے ہیں کہ نصابات اور درسی کتب کے ذریعے سے اقلیتوں کے حقوق پامال ہورہے ہیں جب کہ اکثریت کے جذبات کا انہیں کوئی خیال نہیں ہوتا۔ اب ان لوگوں نے اس ایشو کو سپریم کورٹ تک پہنچادیا ہے۔ جہاں اگر کوئی غلط فیصلہ ہوگیا تو زبردست قومی نقصان ہوگا اور تعلیمی ماحول سخت کھچاؤ کا شکار ہوجائے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ پہلے ہی نیشنل کریکولم کونسل میں تقریباً سو فیصد بالادستی سیکولر لبرل لابی کی ہے جن کی کوششوں سے سنگل نیشنل کریکولم بہت حد تک سیکولرائز کردیا گیا ہے۔ بس اردو اور انگریزی کی درسی کتب میں حمد ونعت اور تاریخی رول ماڈل شخصیات کے حوالے سے شاید بعض صحابہ کرام یا امہات المؤمنین کا

ذکر اور دنیا کی عظیم ترین شخصیت رسول کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کا ذکر ان لبرلسٹوں اور سیکولر سٹوں کے ساتھ خود ساختہ عیسائی نمائندوں کی ذہنی تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔اردو اور انگریزی کی درسی کتب میں زبان سکھائی جاتی ہے جس کے لیے مختلف موضوعات پر اسباق ایک میڈیم کا کام دیتے ہیں۔ان اسباق کے موضوعات سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھی لیے جاتے ہیں، تاریخ اور ثقافت سے بھی لیے جاتے ہیں۔ان موضوعات میں سائنسدانوں کا تذکرہ بھی ہوسکتا ہے قومی ہیروز کا تذکرہ بھی ہوسکتا ہے اور تاریخی شخصیات بھی شامل کی جاتی ہیں۔اب مسلمانوں کے ملک میں تاریخی شخصیات،نبیوں،پیغمبروں،صحابہ کرام،اولیائے عظام اور مجاہدین ملت کے علاوہ اور کن کی ہوسکتی ہے؟ اگر بعض نظریاتی شر پسند اپنے بیرونی آقایان ولی نعمت کی شہ پر اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور پاکستان کی درسی کتب کو اس درسی مواد سے محروم کرنا چاہتے ہیں جس کا پڑھنا پاکستان اور مسلمانوں کے بچوں کا بنیادی حق ہے تو اس حق کا ہم تحفظ کریں گے اور امید ہے کہ ہماری حکومت بھی کرے گی۔اور اگر معاملہ کسی عدالت میں جاتا ہے تو عدالت بھی پاکستان کے مسلم بچوں کے بنیادی حقوق کا خیال رکھے گی اور عوامی امنگوں کے مطابق فیصلے کرے گی۔

بقیہ: یکساں قومی نصابِ تعلیم

جناب وزیر اعظم کو معلوم ہونا چاہئے کہ جنرل ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کے ابتدائی سالوں میں ماہرین تعلیم کے مشوروں سے ایک یکساں نصاب تعلیم مرتب کروایا تھا اور اسے تمام سرکاری و پرائیویٹ سکولوں میں رائج کرنے کی مکمل تیاری بھی کر لی گئی تھی مگر مراعات یافتہ اقلیت'' کو اکثریت والی تعلیم نامنظور تھی۔اس بااثر اقلیت نے بڑی معصومیت سے غیر ممالک سے آنے والے پاکستانی بچوں کیلئے غیر پاکستانی نصاب پڑھانے والے انگلش میڈیم سکول قائم کرنے کی اجازت لے لی۔اس اجازت نامے'' کی آڑ میں ہر طرف سے غیر ملکی نصاب والے سکولوں کا ایک سیلاب آ گیا۔جناب وزیر اعظم کو چاہئے کہ وہ یکساں قومی نصاب کے خود پہریدار بن کر کھڑے ہو جائیں اور کسی کو شب خون مارنے کی اجازت نہ دیں۔(روزنامہ دنیا،۹/اپریل ۲۰۲۱ء)

تعلیم و تربیت
پروفیسر ملک محمد حسین

سپریم کورٹ میں زیر سماعت کیس بسلسلہ نصاب و درسی کتب پس منظر و پیش نظر

۲۰۱۳ء میں پشاور میں عیسائیوں کے چرچ پر حملہ ہوا تھا جس کے بعد ۲۰۱۴ء میں جسٹس تصدق حسین جیلانی (جو اس وقت سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھے) نے سوموٹو ایکشن لیا۔ اس کیس میں عیسائیوں، ہندوؤں اور سکھوں کی چھ تنظیموں نے جن میں دو بشپ، ایک ایم این اے (رمیش کمار) اور سکھ گردوارہ کمیٹی نے نمائندگی کی۔ اس کیس کی آخری سماعت ۹ جون ۲۰۱۴ء کو ہوئی۔ اس کیس میں فیصلے کے طور پر سپریم کورٹ نے ۹ ہدایات جاری کیں جن میں ہدایت نمبر ۲ تعلیم سے متعلق تھی۔ باقی ہدایات کا تعلق اقلیتوں کی جائدادوں، ان کے مذہبی مقامات کی حفاظت اور تقسیم کے وقت چھوڑی گئی پراپرٹی کے ٹرسٹ وغیرہ کے متعلق تھیں۔ تعلیم کے متعلق ہدایت نمبر ۲ کے الفاظ یہ ہیں:

"Appropriate curricula be developed at school and college level to promote culture of religious and social tolerance. In 1981United Nations resolved that the child will be protected from any form of discrimination on the ground of religion or belief. He shall be brought up in the spirit of understanding, tolerance, friendship among people, peace and universal brotherhood, respect for freedom of religion or belief of others and in full consciousness that his energy and talent should be developed to the service of fellowmen."

حیرت ہے کہ سپریم کورٹ نے اس ریزولیوشن کا ایک حصہ بیان کیا جب کہ اس کے آرٹیکل 5.2 کو نظر انداز کیا۔ آرٹیکل 5.2 اس طرح ہے:

"Every child shall enjoy the right to have access to

education in the matter of religious belief in accordance with the wishes of his parents, or as the case may be, legal guardians and shall not be compelled to receive teaching on religion or belief against the wishes of his parents or legal guardians, the best interest of the child being the guiding principle."

تبصرہ

اقوام متحدہ کی قرارداد جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے وہ جنرل اسمبلی کی ایک قرارداد ہے کوئی کنونشن نہیں ہے جس پر رکن ممالک کے لیے عمل کرنا لازم ہو۔ تاہم اس قرارداد میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر تو پاکستان پہلے ہی عمل کر رہا ہے نیز آرٹیکل 5.2 کو اگر دیکھا جائے تو پاکستان کے ۹۷ فیصد مسلمان بچوں کے والدین کی یہ خواہش ہے کہ انہیں نصاب اور درسی کتب کے ذریعے ان کا دین انہیں پڑھایا جائے جس کا قانونی اظہار دستور پاکستان میں شامل قراردادِ مقاصد اور آئین پاکستان کے آرٹیکل 31 کے ذریعے ہوتا ہے۔

۲۰۱۴ء کے سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد کے حالات

۲۰۱۸ء میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے (بذریعہ ڈاکٹر مہدی حسن) اور سنٹر فار سوشل جسٹس نے (بذریعہ پیٹر جیکب) سپریم کورٹ میں اس امر کی پٹیشن دائر کی کہ ۹ جون ۲۰۱۴ء کے سپریم کورٹ کے فیصلے بسلسلہ تعلیمی نصاب پر عمل درآمد نہیں ہو رہا لہٰذا اس سلسلہ میں وفاقی اور صوبائی وزارتِ ہائے تعلیم سے جواب مانگا جائے اور ان کو سپریم کورٹ کے ۲۰۱۴ء کے فیصلے کو نافذ کرنے کی ہدایت کی جائے۔ ان پٹیشنز پر اب تک سات سماعتیں ہو چکی ہیں اور ۳۱ مارچ کو ساتویں سماعت تھی جس میں چیف جسٹس صاحب بہت برہم ہوئے اور وفاقی وزارتِ تعلیم کو ایک ماہ کے اندر اندر نصاب کا مسئلہ حل کرنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی وفاقی سیکریٹری تعلیم کو رپورٹ کے ساتھ حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ۳۱ مارچ کی سماعت کے بعد معاملہ میڈیا میں ہائی لائیٹ ہوا جس کی بنیاد پر راقم الحروف نے فیس بک پر اور واٹس ایپ کے ذریعے ان لوگوں تک معلومات

پہنچائیں جو اس معاملے کی حساسیت کو سمجھتے ہیں۔ الحمدللہ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور کافی تعداد میں لوگوں نے انگڑائی لی اور معاملے کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش شروع کر دی۔

اس سلسلہ میں ۱۰؍اپریل کو کچھ احباب کا ایک ویبنار ہوا جس میں اس مسئلہ پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ شرکاء کا خیال تھا کہ ۲۰۱۴ء میں ہی جب یہ مسئلہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت تھا تو اسلامی تنظیموں کو اس کا نوٹس لینا چاہیے تھا۔ ہوا یوں کہ سپریم کورٹ کے سامنے صرف اقلیتوں کا نقطۂ نگاہ آیا اور اکثریتی مسلمان آبادی کی سرے سے کوئی آواز ہی نہیں آئی۔ اب چونکہ اقلیتی لابی اور سیکولر و لبرل حلقے اکٹھے ہو کر بڑے متحرک طریقے سے اس کیس کی پیروی کر رہے ہیں تو اسلامی حلقوں کو بھی آگے آنا چاہیے اور آئین پاکستان، اقوام متحدہ اور یونیسکو کے کنونشنز اور تعلیم کی ثقافتی، سماجی اور فلسفیانہ بنیادوں کی روشنی میں اپنے آپ کو سپریم کورٹ میں پیش کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یک طرفہ کاروائی کے نتیجے میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان، جو مزاجاً شہنشاہ ہوتے ہیں اور اکثر لبرل بھی ہوتے ہیں، کہیں کوئی ایسا فیصلہ صادر نہ فرمادیں جو پاکستان کے نظریے، پاکستان کے آئین اور پاکستان کی تعلیمی سماجی روایات کے خلاف ہو۔ تجویز پیش کی گئی کہ ایک سے زیادہ تنظیمات سپریم کورٹ میں پارٹی بنیں اور پوری محنت کے ساتھ کیس تیار کر کے پیش کریں۔

ایک تجویز یہ بھی سامنے آئی کہ اسلامی حلقوں میں سے جماعت اسلامی کو اس معاملہ میں متحرک کردار ادا کرنا چاہیے اور ان تنظیموں کی پوری پشت پناہی کرنی چاہیے جو آگے بڑھ کر سپریم کورٹ میں پارٹی بنیں۔ اس سلسلہ میں تنظیم اساتذہ پاکستان، تنظیم اسلامی، تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ، آفاق، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلامی جمعیت طلبہ، تحریک اسلامی، حرا نیشنل ایجوکیشن فاؤنڈیشن جیسی تنظیمات کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی اگر خدانخواستہ تیار نہ ہو تو جماعت اسلامی کو آگے قدم بڑھانا چاہیے۔

اس امر پر حیرت کا اظہار کیا گیا کہ ۲۰۱۳ء میں سوموٹو ایکشن چیف جسٹس تصدیق حسین جیلانی صاحب نے لیا۔ اور فیصلہ بھی انہوں نے کیا جو اپنی سیکولر اور لبرل سوچ کے حوالے سے

معروف تھے [1] اور اب اقلیتی اور سیکولر لابی جو سپریم کورٹ میں گئی ہے وہ بھی جیلانی لا ایسوسی ایٹس کے ذریعے گئی ہے جو تصدق حسین جیلانی کا بیٹا چلا رہا ہے۔

یہ معاملہ قومی اور اسلامی اہمیت کا ہے اور اس پر اگر پورے زور سے توجہ نہ دی گئی تو بہت بڑا نظریاتی تعلیمی نقصان ہونے کا خدشہ ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اقلیتی اور سیکولر لابی کو سنگل نیشنل کریکولم اور اس کے مطابق تیار کی گئی ماڈل ٹیکسٹ بکس کا پورا علم ہے۔ ان تک وزارتِ وفاقی تعلیم اور نیشنل کریکولم کونسل کے ارباب بست وکشاد پوری معلومات پہنچاتے ہیں اور تمام جماعتوں کے تمام مضامین کی درسی کتب کی ریویو کمیٹی میں اقلیتوں کا ایک نمائندہ بٹھایا گیا ہے جس کے پاس پورا ڈیٹا ہوتا ہے۔ پیٹر جیکب اینڈ کمپنی اس وقت کہہ رہے ہیں کہ انگریزی کی چوتھی جماعت تک ۲۳ فیصد مواد اسلامیات پر مبنی ہے۔ پانچویں کی انگریزی کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں ۲۱ فیصد مواد اسلامیات پر مبنی ہے۔ نیز اردو کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ ۲۵ فیصد مواد اسلامیات پر مبنی ہے۔ ان کی سپریم کورٹ میں ڈیمانڈ ہے کہ ہمارے اقلیتی مذہب کے بچوں کو اردو اور انگریزی میں جبراً اسلامیات پڑھائی جا رہی ہے جو آئین کے آرٹیکل 20 اور 22 کی خلاف ورزی ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ اردو کی درسی کتابوں میں ہمارے غیر مسلم بچوں کو حمد اور نعت پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے لہٰذا یہ سارا اسلامیات کا مواد، حمد اور نعت درسی کتابوں سے خارج کیا جائے۔

صورتِ حال یہ بن رہی ہے کہ صرف تین فیصد اقلیتی آبادی کے بہانے بعض سیکولر اور لبرل حلقے ۹۷ فیصد اکثریتی مسلم آبادی کے بچوں کے تعلیمی حقوق غصب کرنا چاہتے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ ۹۷ فیصد اکثریتی مسلم آبادی کے نظریاتی کرتا دھرتا سو رہے ہیں یا دیگر سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اگر ہماری آئندہ نسل کو اپنے دین سے ہی بے بہرہ کر دیا گیا تو باقی کیا بچے گا؟ اسلامی نظریۂ حیات کے تحفظ کے لیے یہ SOS کال ہے۔ ہے کوئی جو اس کال پر کان دھرے؟

پس نوشت

جو خواتین و حضرات اس تحریر کو پڑھیں اور کچھ کرنے کا جذبہ اپنے اندر پائیں تو پہلا کام یہ

[1] انہوں نے سپریم کورٹ میں اپنے آخری دن یہ فیصلہ سنایا تھا کہ اقوام متحدہ کے ہیومن رائٹس چارٹر کی رو سے ایک آدمی کو مذہب بدلنے کا پورا حق ہے اور ایک آدمی صبح کو مسلمان اور شام کو عیسائی ہو سکتا ہے اور شام کو عیسائی اور صبح کو مسلمان ہو سکتا ہے۔ اس طرح انہوں نے اسلام کے قانون ارتداد کا کھلم کھلا مذاق اڑایا تھا۔

ہے کہ سپریم کورٹ سے متعلقہ پٹیشنز کی نقول حاصل کی جائیں۔ دوسرا کام یہ ہے کہ وفاقی وزارتِ تعلیم نے جو جواب داخل کیا ہے اس کی نقل لی جائے اور تیسرا کام یہ ہے کہ اگر کسی کا وفاقی وزارتِ تعلیم اور نیشنل کریکولم کونسل کے ارباب بست وکشاد پر کوئی اثر ورسوخ چلتا ہو تو نئے نصاب پر مبنی ماڈل درسی کتب کے مسودے حاصل کیے جائیں تا کہ سپریم کورٹ میں جانے اور وہاں کیس لڑنے کے لیے تیاری کی جاسکے۔ رویوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفاقی وزارتِ تعلیم اور نیشنل کریکولم کونسل کے ذمہ داران بجائے اکثریتی مسلمان آبادی کے بچوں کے تعلیمی حقوق کی پاسداری کرنے اور آرٹیکل 31 کے تقاضے پورے کرنے کے اقلیتی عناصر کی شرارتوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ آرٹیکل 31 ریاست سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ پاکستان کے لوگوں کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکیں جیسا کہ قرآن وسنت میں صراحت سے بتایا گیا ہے۔ یہی تقاضا قرار داد مقاصد کا بھی ہے اور اس تقاضے کی تکمیل تعلیم سے ہی ممکن ہے جس کا وسیلہ تعلیمی نصاب اور درسی کتب ہیں۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت: سالانہ 500 روپے پانچ سال: 2000 روپے تاحیات: 10,000 روپے

نام.................................پتہ.................................

.................................فون.................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان کے مستقبل کے خلاف ایک گھناؤنی سازش

سیکولر، لبرل اور بیرونی طاقتوں کی اشیر باد سے چلنے والی عیسائیوں کی مقامی این جی اوز کے گماشتوں نے پاکستان کی سکولوں کے لیے تیار کی جانے والی درسی کتب کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا ہے اور اب روز نامہ جنگ میں جناب انصار عباسی کی رپورٹ کے مطابق شعیب سڈل پر مشتمل یک رکنی کمیشن نے سفارش کی ہے کہ پہلی سے پانچویں جماعت کی اردو، انگریزی اور جنرل نالج کی درسی کتب سے حضرت محمد ﷺ، صحابہ کرام، خلفائے اسلام اور ان کی اخلاقی تعلیمات نیز مشاہیر اسلام سے متعلق اسباق نکالے جائیں کیونکہ یہ لازمی مضامین ہیں اور اقلیتی والدین کے بچوں نے بھی یہ لازمی مضامین پڑھنے ہیں جبکہ آئین کے آرٹیکل ۲۲ کے مطابق اقلیتی طلباء کو ان کے مذہب کے علاوہ اسلام کے متعلق مواد پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کی تاریخ بلکہ دنیا کی تعلیمی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ہو رہا ہے کہ اس طرح کے بے ہودہ اعتراضات اٹھائے جا رہے ہیں۔ پوری دنیا کی درسی کتب میں قوم کے ہیروز، محترم شخصیات، رول ماڈلز اور آئندہ نسل کی رہنمائی کے لیے زباندانی کے مضامین میں ایسے اسباق دیے جاتے ہیں۔ یہ جن موضوعات کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور جن پر مذہبی ہونے کا اعتراض کیا جا رہا ہے وہ اسلامی تاریخ کے علاوہ دنیا کی تاریخ کے موضوعات ہیں۔ یہ مذہبی موضوعات نہیں ہیں کہ ان کے ذریعے سے نماز کے فرائض، وضو کی سنتیں یا ارکان اسلام اور عقائد اسلام کی بات کی جا رہی ہو۔ ہم نے تو اردو میں ایڈیسن کی کہانی بھی پڑھی تھی جب کہ ایڈیسن عیسائی تھا۔ اس کا ذکر ایک موجد کی حیثیت سے تھا نہ کہ عیسائی کی حیثیت سے۔ کمیشن نے اپنی جہالت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ حمد و نعت ادب کا حصہ نہیں ہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات ہیں۔ ہم تو اس جاہلانہ دعوے کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

ایک اور پہلو اس صورتِ حال کا یہ ہے کہ محض ۲ فیصد اقلیتوں کے لیے ۹۸ فیصد اکثریت کے بچوں کو ان کی تاریخ، ثقافت اور روایات کی تعلیم سے محروم کرنا کہاں کا انصاف ہے اور ایسا دنیا کے کس ملک میں ہوتا ہے؟ ہم نے ۲ فیصد اس لیے کہا کہ تین فیصد اقلیتوں میں ایک فیصد تو قادیانی ہیں اور ہمارے نزدیک اگرچہ وہ غیر مسلم ہیں لیکن انہیں تو اس مواد پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ

مسلمان اکثریتی بچوں کو ان کی تاریخ، ان کی ثقافت اور ان کی روایات سے سکول کی تعلیم میں روشناس کرایا جائے۔ رہ گیا مذہب تو اس کے لیے تو سب مذاہب کے طلباء کے لیے الگ الگ نصاب اور کتاب کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اور ایک تیسرا پہلو اس معاملے کا یہ ہے کہ جب یہ روچل پڑی تو پھر یہ کہا جائے گا کہ:

۱۔ مارننگ اسمبلی میں تلاوت، نعت، قومی ترانہ اور اخلاقی باتیں نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اسمبلی میں اقلیتی مذاہب کے بچے بھی کھڑے ہوتے ہیں۔

۲۔ سکولوں میں جو بزم ادب ہوتی ہے اس میں حمد، نعت، ترانے اور اسلامی نظمیں اور اسلامی موضوعات پر تقریریں نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ بزم ادب میں بھی اقلیتی گروہوں کے بچے موجود ہوں گے اور انہیں ان کے مذہب سے ہٹ کر کسی دوسرے مذہب کی باتیں نہیں سنائی جاسکتیں۔

۳۔ سکولوں میں سلام مسنون کا رواج ہوتا ہے۔ استاد شاگردوں کو، شاگرد اساتذہ کو، اور دیگر لوگ بھی ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ اعتراض آئے گا کہ یہ تو اسلامی عمل ہے اور سکولوں میں اقلیتی بچے بھی ہیں لیکن ان کو تو یہ کہنے اور سننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ پاکستان مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور یہاں تعلیمی اداروں میں بھی اسلامی معاشرت کو رواج بھی دیا جاتا ہے اور ان پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ اقلیتی معترضین اس پر اعتراض اٹھائیں گے کہ سکولوں میں ان کے بچے بھی ہوتے ہیں اور انہیں ان کی مذہبی معاشرت کے علاوہ کسی اور معاشرت کو دیکھنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

غرض ایک ایک احمقانہ، جاہلانہ اور سازشانہ روچل پڑی ہے تو اس کی کوئی حد نہیں ہوگی۔ اور آخری بات یہ کہ پورے ملک میں کتنے سکول ہوں گے جہاں کوئی اِکا دُکا اقلیتی مذہب کا بچہ ہوگا۔ سروے کرا لیا جائے لیکن ہمارا اندازہ یہ ہے کہ شاید ایک فیصد سکول ہی ہوں جہاں کسی نہ کسی کلاس میں کوئی ایک آدھ ہندو یا عیسائی بچہ نظر آجائے۔ تو اصل بات یہ ہے کہ یہ مہم ۲ فیصد اقلیتی طلبہ کو اسلام کی زبردستی تدریس سے بچانے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ در پردہ ۹۷ فیصد مسلمان طلبہ کو ان کی تاریخ، ثقافت، روایات اور سماجی تعلقات سے لاعلم رکھنا چاہتے ہیں اور انہیں اپنے شاندار ماضی سے بے خبر رکھنے کی مذموم سازش ہے جس کا وطن عزیز کے محب اسلام اور محب وطن حلقوں کو احساس کرنا چاہیے اور اس سازش کے خلاف بند باندھنا چاہیے۔

تعلیم و تربیت　　ڈاکٹر حسین احمد پراچہ

یکساں قومی نصابِ تعلیم

ہم بھی بڑے دل چسپ لوگ ہیں۔ یہاں کوئی بھی شخص محض دل لگی کی خاطر یا اپنے ذاتی ذوق کی تسکین کے لیے طے شدہ آئینی و قومی امور پر نقطۂ اعتراض اٹھا دیتا ہے اور عدالت جا پہنچتا ہے۔ وزیر اعظم نے اس قوم کو اپنی انتخابی مہم کے دوران بہت سے خوش رنگ خواب دیئے تھے۔ ان کے جس خواب میں میرے لیے مقناطیس جیسی جاذبیت تھی وہ یکساں نصابِ تعلیم کا خواب تھا۔ تقریباً اڑھائی برس تک وزیر تعلیم شفقت محمود کی سر براہی میں وزارتِ تعلیم کے افسران اور ماہرین تعلیم اس خواب کے خاکے میں رنگ بھرنے اور اسے حقیقت کا روپ دینے کے لیے شب و روز کوشاں رہے۔ اب یہ قومی نصاب آخری مراحل پر پہنچا ہے تو اقلیتوں کے کچھ نمائندوں نے عدالت میں رٹ دائر کر دی کہ وزارتِ تعلیم کے مجوزہ نصابِ تعلیم میں اسلامی تعلیمات کو انگریزی اور اردو جیسے لازمی مضامین کا بھی حصہ بنایا گیا ہے۔ مثلاً اُن کے نقطۂ نظر کے مطابق حمد و نعت کو اردو نصاب میں شامل نہیں کیا جانا چاہئے۔ یہاں اصل مسئلہ غیر مسلم اقلیت کا نہیں، مٹھی بھر سیکولر حضرات اور مراعات یافتہ اقلیت کا ہے جو اپنے بچوں کو قومی نصاب نہیں غیر ملکی نصاب پڑھانا چاہتی ہے تا کہ گزشتہ دہائیوں کی طرح اُن کے بچوں کی امتیازی شان اور پہچان الگ رہے۔

ایک معاصر میں چھپنے والے ایک کالم کے مطابق وزارتِ تعلیم کے ایک افسر نے کہا ہے کہ ایک طبقہ لازمی مضامین میں سے اسلامی نصاب نکالنے کی کوشش میں ہے۔ افسر موصوف نے کہا کہ قرآنِ پاک صرف مسلمان طلبہ کو پڑھایا جائے گا جبکہ لازمی مضامین میں شامل حمد و نعت بھی صرف مسلمان طلبہ کے لیے ہی لازم ہوگی۔ شاید یہی افسر یا اُن جیسے ہی کوئی بے خبر افسر وزارتِ تعلیم کی نمائندگی کرنے سپریم کورٹ میں گئے ہوں گے جہاں وہ عدالتِ عظمیٰ کو مطمئن نہیں کر سکے جس پر عدالت نے برہمی کا اظہار کیا۔ کیا وزارتِ تعلیم کے افسران کو اتنا بھی علم نہیں کہ حمد و نعت اور مثنوی و مرثیہ اردو شاعری کے اہم ترین اجزا ہیں۔ مسلمان تو مسلمان ہندو، سکھ اور دیگر ادیان سے تعلق رکھنے والے اردو شعرا نے نہایت اعلیٰ پائے کی ادبی نعتیں کہی ہیں اور کئی حمدیہ نظمیں تخلیق کی

ہیں۔ ان ادب پاروں کو اردو لٹریچر میں نہایت نمایاں مقام حاصل ہے۔ غیر مسلم شعرا تو مدحتِ رسول کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں۔ یہ حمد و نعت کے ادبی شاہکار مسلم و غیر مسلم طلبہ کے لیے یکساں طور پر ضروری ہیں۔ دلو رام کوثری مشہور نعت گو شاعر ہیں۔ اُن کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

کچھ عشقِ محمد میں نہیں شرطِ مسلماں
ہے کوثری ہندو بھی طلبگارِ محمد

مثنوی 'گلزار نسیم' پنڈت دیا شنکر نسیم کی لکھی ہوئی ہے۔ اسے اردو ادب کا ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس مثنوی کا آغاز حمد باری تعالیٰ، نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اطاعت پنجتن سے ہوتا ہے۔

سکھ شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

میں نے کم وقت میں نہ صرف آن لائن بلکہ ایک دو امریکی دوستوں سے امریکہ کے سرکاری سکولوں میں پڑھائے جانے والے نصابِ تعلیم کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہر امریکی بچے کو ایلیمنٹری اور جونیئر و سینئر ہائی سکول میں امریکہ کی تاریخ کے اہم واقعات اور امریکہ کے ہیروز کے بارے میں بہت کچھ پڑھایا جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سکولوں کے لازمی مضامین میں بائبل کو بطورِ تاریخ، کلچر، لٹریچر اور اخلاقیات پڑھایا جاتا ہے؛ البتہ بطورِ مذہب بائبل الگ پڑھائی جاتی ہے۔

جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے تو اسلامی اور دیگر ادیان کی اقدار حتیٰ کہ سیکولر تعلیمات میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔ مثلاً انگلش یا اردو میں اعلیٰ اخلاقی اقدار اور آدابِ معاشرت کا تذکرہ اسلامی تعلیمات و تاریخ کی روشنی میں کیا جاتا ہے تو اس پر کسی غیر مسلم کو کیونکر اعتراض ہوگا۔

مجھے حیرت ہے کہ وزارتِ تعلیم کے افسران اور ہمارے سیکولر دانشوروں کو اس حقیقت کا ادراک کیوں نہیں کہ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے جس میں مذہب، سائنس، تاریخ، فلسفہ اور بہت کچھ شامل ہوتا ہے کیونکہ ادب پارہ تخلیق کرتے ہوئے شاعر یا ادیب غیر فطری طریقے سے اپنے تخلیقی شاہکار میں مذہبی و آسمانی حوالوں کا داخلہ بند نہیں کرتا اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ برنارڈ شا مشہور ڈرامہ نگار ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مختلف الخیال اور کئی اقوام سے تعلق رکھنے

والے انسانوں کو اپنے اندر سمونے کی جس مذہب میں سب سے زیادہ صلاحیت ہے وہ اسلام ہے۔اسی طرح تاریخِ عالم میں جتنی پرکشش شخصیت محمد مصطفی ﷺ کی ہے اتنی کسی اور کی نہیں؛ اسی لیے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساری دنیا کا نجات دہندہ سمجھتا ہوں۔ برنارڈ شا کا ڈرامہ پڑھاتے ہوئے اور اس کی شخصیت کے بارے میں بتاتے ہوئے انگریزی کا ٹیچر اسلام کے بارے میں ڈرامہ نگار کے خیالات بتائے گا تو ان تاریخی ریمارکس پر کسی غیر مسلم طالبعلم کو کیونکر اعتراض ہوگا۔

کیا ہم انگلش لٹریچر پڑھتے ہوئے John Milton کا ادبی شاہکار Paradise Lost اور دانتے کی Divine Comedy کا تخلیقی ادب پارہ اس لیے نہیں پڑھیں گے کہ وہ مسیحی تعلیمات وعقائد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اپنے قومی اہداف کی روشنی میں ہر قوم اپنی تاریخ، اپنے کلچر اور اپنی مذہبی وتہذیبی اقدار کی عکاسی کرنے والا یکساں قومی نصابِ تعلیم تشکیل دیتی ہے جس میں اپنے ہیروز کے عظیم کارناموں سے نئی جنریشن کو متعارف کروایا جاتا ہے۔امریکہ کے بارے میں ہم اوپر بتا چکے ہیں۔جاپان کے تمام سکولوں میں یکساں قومی نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ وہاں پرائیویٹ سکولوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں؛ تاہم ان سکولوں میں بھی سرکاری نصاب ہی پڑھایا جاتا ہے؛البتہ انہیں مذہب اور میوزک کے بارے میں اضافی تدریس کی اجازت ہے۔

دیگر ممالک کی طرح پاکستان کے سکولوں کے لازمی مضامین میں اسلامی اقدار اور قومی وملّی شخصیات کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے۔ ہمارے سکولوں میں اسلامیات کو بطورِ لازمی مضمون پڑھایا جاتا ہے جبکہ غیر مسلموں کے لیے اخلاقی تعلیمات کا الگ نصاب موجود ہے؛ تاہم جس چیز کو اقلیت کے کچھ نمائندے اور ہمارے بعض سیکولر دانشور اسلامی تعلیمات قرار دے رہے ہیں وہ شاعری، ادب اور ہمارا تہذیبی وتاریخی ورثہ اور ہمارے قابلِ فخر ہیروز کے کارنامے ہیں۔ان سب چیزوں کو اگر لازمی مضامین سے نکال دیا جائے تو پھر پیچھے چھان بورا ہی بچے گا۔وزارتِ تعلیم کو چاہئے کہ وہ قومی وملّی شعور رکھنے والے ماہرین تعلیم کی رہنمائی میں جناب وزیر اعظم کو بریفنگ دے۔ اسی طرح وزارتِ تعلیم کے نمائندے عدالت عظمیٰ کی اگلی پیشی پر تیاری کر کے جائیں اور اپنے مؤقف کو منطقی دلائل کے ساتھ پیش کریں۔ (بقیہ صفحہ نمبر:۹)

تعلیم و تربیت اوریا مقبول جان

ہر ریاست کا نصابِ تعلیم۔ ریاست کے نظریہ پر مبنی ہوتا ہے

نیویارک کے بروکلین (Brooklyn)، پیرس کے بیل ویل (Belleville)، لندن کے گولڈن برگ (Goldenberg) اور یورپ کے شہروں میں وہ آبادیاں جہاں یہودیوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، ایسے علاقوں کے سکولوں میں یہودی بچے کرسمس اور ایسٹر کے تہواروں کے بارے میں گیتوں اور ان گیتوں میں جیتے جاگتے کرداروں کو ایک خوبصورت خوابناک ماحول میں نرسری کی نظموں سے لے کر بڑی کلاسوں تک آج بھی پڑھتے ہیں۔ کورس میں سیدنا عیسیٰؑ اور سیدہ مریمؑ کے حوالے سے گفتگو خواہ تہوار کی نسبت سے ہی کی جائے یہودیوں کے نزدیک بالکل ایسے ہی ہے جیسے مسلمانوں کے کسی سکول میں کسی مدعی نبوت کے یومِ پیدائش اور یومِ وفات کو ایک قومی تہوار کے طور پر نہ صرف پڑھایا جائے، بلکہ ان دنوں میں تمام تعلیمی ادارے ان تہواروں کے رنگ میں بھی رنگ جائیں۔ لیکن ان تمام ملکوں میں کوئی جسٹس تصدق حسین جیلانی سوموٹو نہیں لیتا، کوئی شعیب سڈل کی سربراہی میں ایک آدمی والا نصابِ تعلیم کمیشن نہیں بنتا اور نہ ہی وہاں کوئی ایسا کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ مسلمان بچوں نے اگر اپنے مذہب کی شخصیات اور تہواروں کے بارے میں پڑھنا ہے تو جا کر اپنی اسلامیات کی کتاب میں جا کر پڑھو، ہماری اجتماعی تاریخ، ثقافت اور تہذیب سے تمہیں کیا سروکار۔ چھیانوے فیصد مسلمان جنہوں نے آج سے تہتر سال پہلے یہ ملک ہندوستان کے جغرافیے سے اس لیے علیحدہ کیا تھا کہ یہاں اسلامی طرزِ زندگی پر عمل درآمد کریں گے، انہیں کہا جا رہا ہے کہ تمہاری جرات کیسے ہوئی کہ 2 فیصد ہندوؤں اور 1.5 فیصد عیسائیوں کے ساتھ ایک کلاس میں بیٹھ کر اور ایک ہی کتاب میں رمضان، عید، سیدنا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور عید قرباں، میلاد الرسول ﷺ کا جشن اور سیدنا امام حسینؓ کی لازوال قربانی اور واقعہ کربلا جیسے موضوعات پڑھو۔ ان تہواروں پر چھٹیاں تو اس لیے دی جاتی ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن جب تم تاریخ کی کتابوں میں مسلمان شخصیات کا ذکر کرتے ہو تو ہمارے بچوں کی ''طبع نازک'' پر گراں گزرتا ہے۔ اس رپورٹ کے علاوہ ایک اور منطق بھی عموماً بگھاری جاتی رہی ہے اور خصوصاً ہمارے صوبہ سندھ کے سیکولر دانشور

نصابِ تعلیم مرتب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں تو اپنی دھرتی کے ہیروز کو ہر حال میں پڑھانا ہے، خواہ محمد بن قاسم جو اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے، ہمیں اسکی توہین ہی کرنا پڑے۔ ایسا لوکل نان لوکل ہیروز کا ایشو کبھی آسٹریلیا سے لے کر کیلفورنیا کے ساحل تک کہیں نہیں اٹھایا جاتا۔ کوئی نہیں کہتا کہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک ساحلی علاقے فلسطین میں پیدا ہونے والے پیغمبر سیدنا عیسیٰؑ کا ڈنمارک، سویڈن، جرمنی، انگلینڈ اور امریکہ سے کیا تعلق ہے۔ انہوں نے تو زندگی بھر ایک لمحے کے لیے بھی ان علاقوں میں قدم تک نہیں رکھا۔ پاکستان کے سکولوں میں مسلمانوں کے تہواروں اور شخصیات کے ایام کے حوالے سے ویسی رنگا رنگی نہیں پائی جاتی جیسی مغربی دنیا میں مذہبی تہواروں کے حوالے سے پائی جاتی ہے۔ امریکہ اور یورپ کے سکولوں میں کرسمس اور ایسٹر کے حوالے سے نظمیں گائی جاتی ہیں، خوبصورت، دلکش اور دیدہ زیب کتابیں آغاز میں ہی بچوں کو دی جاتی ہیں۔ جس طرح سانتا کلاز اور ''کرسمس ٹری'' کو کلاسوں کی زیب وزینت کا حصہ بنایا جاتا ہے اس سے کوئی ایک لمحے کے لیے یہ تاثر نہیں لے سکتا ہے کہ یہ ممالک دراصل سیکولر، لبرل ہیں۔ کیا یہ تمام ممالک وہاں موجود اقلیتوں کے کسی تہوار کو اپنے بچوں کے نصاب کا حصہ بناتے ہیں۔ میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کی عید الاضحیٰ کے تہوار کو بچوں کو سمجھانے کے لیئے حضرت ابراہیمؑ اور سیدنا اسماعیلؑ کی قربانی کا تذکرہ ہی نصاب میں شامل کیا جائے تو وہاں ہنگامے پھوٹ پڑیں۔ کیونکہ یہ قربانی ہی چند بڑے اختلافی امور میں سے ہے۔ یورپ کی تاریخ بچوں کے نصاب میں نہ صرف یورپ کے ممالک میں پڑھائی جاتی ہے بلکہ امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے بچوں کو ہیروز کی یک رنگی (Uniformity Heros) کے تصور کے تحت لازماً پڑھائی جاتی ہے۔ اس تاریخ کا ایک اہم ترین کردار روم کا بادشاہ کانسٹین ہے جس کی موجودہ عیسائی مذہب میں سب سے اہم حیثیت ہے۔ اس سے پہلے عیسائی صلیب نہیں اٹھاتے تھے اور نہ ہی ایک متفقہ بائبل رکھتے تھے۔ موجودہ عیسائیت کی تمام اہم علامتیں خواہ وہ صلیب ہو یا ایک متفقہ انجیل، کرسمس کی تاریخیں ہوں یا ایسٹر اور گڈ فرائیڈے کے تہواروں کی رسومات سب کی سب اس ایک شخصیت کی مرہونِ منت ہیں۔ کانسٹین کو ''سینٹ'' کا درجہ حاصل ہے اور کوئی عیسائی اکثریت والا ملک ایسا نہیں ہے، خواہ وہ افریقہ میں ہی کیوں نہ واقع ہو، جہاں نصاب کی کتابوں میں سیدنا عیسیٰؑ، سیدہ مریمؑ اور سینٹ پیٹر کے ساتھ اس کی شخصیت کو نہ پڑھایا جاتا ہو۔ کانسٹین کا ذکر ان کے مذہبی نصاب نہیں، بلکہ تاریخی نصاب کا حصہ ہے۔

حالانکہ کینیا، یوگنڈا اور تنزانیہ کا روما کی سلطنت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ یورپ اور امریکہ کے سکولوں میں بچوں کے لیے تاریخ کی کتابیں انتہائی شاندار اور دل موہ لینے والی ہوتی ہیں اور ان میں ایک خوابناک سا تصویری ماحول چھایا ہوتا ہے۔ یہ رنگا رنگ کتابیں سکولوں میں عیسائیوں کے علاوہ مسلمان، یہودی، ہندو اور سکھ بچہ بھی پڑھتا ہے اور مذہبی نظمیں بھی گنگناتا ہے۔ کیا امریکہ کے کسی سکول کی تاریخ کی کتابوں میں گوروں کے آباء واجداد کا وہاں کی مقامی آبادی ریڈ انڈین قبائل پر ظلم، وحشت، درندگی اور تشدد کی داستانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ کیا انہیں بتایا جاتا ہے کہ جو تمہارے ساتھ اس وقت ایک دو فیصد ریڈ انڈین امریکی شہری ہیں یہ کبھی اس ملک میں سو فیصد ہوا کرتے تھے۔ دنیا کا ہر ملک ایک نظریے اور طرزِ زندگی پر قائم ہے۔ اس کی ریاست وحکومت اس نظریے کے تحفظ کی ضامن ہوتی ہے۔ یہ نظریہ جمہوریت یا بادشاہت ہو، فاشزم، کمیونزم یا سیکولرزم ہو، غرض نظریہ ہی ہر ملک کے قیام کی اساس ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک کے تعلیمی اداروں میں ہر قوم کے نظریہ کو ہی پڑھایا جاتا ہے اور اسی کے بارے میں محبت پیدا کی جاتی ہے۔ کیا امریکہ کے بچے سکولوں میں اس امریکی کرسچن صیہونی اقلیت کا نظریہ پڑھتے ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن ہم جمہوریت کی بجائے انجیل مقدس کا نظام امریکہ میں نافذ کر دیں گے۔ جرمنی میں آج بھی نسل پرست فاشسٹ ہٹلر سے محبت کرنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے لیکن کیا ہٹلر ان کے نصاب میں موجود ہے۔ لیکن پاکستان سے یہ مذاق اس کی تخلیق کے دن سے کیا جا رہا ہے۔ ہر دوسرے دن یہ سوال پوچھا جاتا ہے یہ ملک کیوں بنایا گیا تھا۔ یہ سوال کرنا دراصل ان لاکھوں شہداء کے خون کا تمسخر اڑانا ہے جو اپنا گھر بار، جائیداد اور والدین کی قبریں چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ ان کو خوب معلوم تھا کہ یہ ملک صرف مسلمانوں کے لیے بنایا جا رہا ہے۔ تحریکِ پاکستان کا مقصد مسلمانوں کو ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور بدھ مت والوں سے علیحدہ کر کے ایک خطے میں جمع کرنا تھا۔ قیام پاکستان کے وقت جتنے مسلمان بھی اس پاکستان میں جمع ہو سکے اب ان کا نظام اور ریاستی نظریہ صرف اسلام ہے۔ دیگر مذاہب کے جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں ویسی ہی تعلیمی نصاب میں آزادی ملنی چاہیے جتنی بروکلین میں ایک یہودی کو، اسرائیل کے نصاب میں ایک عیسائی کو اور بھارت میں ایک مسلمان بچے کو حاصل ہے۔

تعلیم و تربیت

انصار عباسی

اسلامی نصاب کے متعلق تشویش

اگر عمران خان حکومت کی کسی پالیسی سے مجھے دلی خوشی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ کامیاب ہو تو وہ تعلیمی نصاب میں قرآن وسنت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے رول ماڈلز اور ہیروز کو نئی نسل سے روشناس کروانا ہے تاکہ ہم نہ صرف اپنی دینی تعلیمات کو جان سکیں اور اُن پر عمل کر کے بہتر مسلمان بن پائیں بلکہ اُس روشن اسلامی تاریخ سے ترغیب لیں جب مسلمان دین کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم میں بھی سب سے آگے تھے اور اپنے ایمان، عمل، محنت، اخلاق، علم اور جذبے کی بدولت دنیا میں سب سے بڑی قوت بن کر ابھرے۔

عمران خان تعلیمی نصاب کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں اور قرآن پاک لازمی پڑھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہدایت جاری کر چکے ہیں کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لازمی طور پر تعلیمی اداروں میں بچوں کو پڑھایا جائے۔

اس سلسلے میں بہت کام ہو رہا ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق پنجاب، خیبر پختون خوا، بلوچستان اور آزاد کشمیر میں اس سلسلے میں ضروری اقدامات اُٹھائے جا رہے ہیں لیکن سندھ ابھی بہت پیچھے ہے اور شاید وہاں کی حکومت اپنی روشن خیالی اور سیکولر سوچ کی وجہ سے اُس تعلیمی نصاب کا حصہ نہیں بننا چاہ رہی جس کے لئے باقی سارا پاکستان راضی ہے۔

اس بارے میں مَیں پوری معلومات لے کر پھر کبھی لکھوں گا لیکن ابھی جس مسئلہ کی طرف میں وزیر اعظم عمران خان اور دوسرے ذمہ داروں کی توجہ دلوانا چاہ رہا ہوں، وہ اس طبقہ کی وہ کوششیں ہیں، جو چاہتا ہے کہ تعلیمی نصاب کو اسلامی تعلیمات کے مطابق مرتب نہ کیا جا سکے۔

اس سلسلے میں مجھے حکومتی ذرائع سے معلوم ہوا کہ حکومت پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ حمد و نعت اور دوسرے اسلامی مواد کو لازمی مضامین بشمول اردو اور انگریزی سے نکال کر اسلامیات میں شامل کر دیا جائے۔ اس کی تاویل یہ دی جا رہی ہے کہ غیر مسلم طلبہ کو کیوں حمد و نعت اور دوسرا اسلامی نصاب پڑھایا جائے؟

اس سلسلے میں آئین کی شق 20 کا حوالہ بھی دیا جارہا ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق وزیراعظم عمران خان کو اس سلسلے میں ابھی تک بریف نہیں کیا گیا۔ نئے نصاب پر کام کرنے والے ایک سرکاری افسر سے میری بات ہوئی تو وہ پریشان دکھائی دیے اور کہا کہ ایک طبقہ جان بوجھ کر کنفیوژن پھیلا کر لازمی مضامین میں سے اسلامی نصاب نکالنے کی کوشش میں ہے۔

اس سرکاری افسر کا کہنا تھا کہ قرآن پاک کو تعلیمی اداروں میں صرف مسلمان طلبہ کو پڑھایا جائے گا جبکہ لازمی مضامین میں شامل حمد و نعت بھی مسلمان طلبہ کے لئے ہی لازم ہوگی جبکہ غیر مسلم اسٹوڈنٹس کے لئے نصاب کا یہ حصہ پڑھنا نہ لازم ہوگا نہ ہی، اس بارے میں ان سے امتحان میں کوئی سوال پوچھا جائے گا۔ جہاں تک سیرت النبی ﷺ کی بات ہے اور اسلامی تاریخ اور اسلامی ہیروز کے متعلق نصاب کا تعلق ہے تو میرے خیال میں تمام طلبہ کو یہ نصاب پڑھانا چاہئے کیوں کہ اس کا تعلق تو تاریخ، علم اور معلومات سے بھی ہے۔

حضرت محمد ﷺ کو پوری انسانیت کے لئے رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا گیا، اس لئے آپؐ کی اسوہ حسنہ کے بارے میں آگاہی پھیلانا ہر اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہونی چاہئے۔ ایک طبقہ اس بات پر بھی اعتراض کر رہا ہے کہ نصاب میں اسلامی تعلیمات کو زیادہ شامل کیا جارہا ہے۔

اس طبقہ کو اصل مسئلہ اس بات پر ہے کہ حکومت نے تعلیمی اداروں میں قرآن پاک اور سیرت النبی ﷺ لازمی طور پر پڑھانے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ کچھ تو اخباروں میں لکھے گئے اپنے مضامین اور ٹی وی ٹاک شوز میں عمران خان کا جنرل ضیا سے تقابل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عمران خان نے تو تعلیمی نصاب کو ضیاء الحق سے بھی زیادہ اسلامی کردیا۔

کوئی پوچھے کہ ایک اسلامی ملک میں اگر بچوں کو اسلام نہیں پڑھایا جائے گا تو اُنہیں کیا کوئی دوسرا مذہب پڑھایا جائے؟ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اعتراض نصاب میں شامل کسی دوسرے مضمون اور مواد کے بارے میں نہیں بلکہ صرف اسلام پڑھانے پر ہے۔ میری تمام ریاستی ذمہ داروں، سیاسی جماعتوں اور اسلامی حلقوں سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں حکومت کا ساتھ دیں۔

(روزنامہ جنگ، ۵/اپریل ۲۰۲۱ء)

تعلیم و تربیت ڈاکٹر سمیرا ملک

نصاب تعلیم ایک بار پھر سازشوں کی زد میں

دیارِ کفر اس حقیقت کا مکمل ادراک رکھتا ہے کہ اگر ظہور اسلام ہوگا تو وہ اسی پاک خطۂ عظیم سے ہوگا، لہٰذا اگر اس خطے کے بسنے والوں کو اسلامیایا گیا تعلیمی نصاب مہیا کرنے کے راستے ہموار ہو گئے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کا یہ اندیشہ اٹل حقیقت بننے سے نہیں روک سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ صہیونی طاقتوں نے کئی صدیوں سے مسلم دنیا میں تعلیمی شعور کو پنپنے نہیں دیا۔ یہ شعور جس کا منبع حقیقتاً وہ نظام تعلیم ہے جسے اسلام کے بنیادی اصول و معلومات کی پکی مٹی سے گھڑا جاتا ہے۔ دشمنان اسلام کے لیے یہ وہ ازلی خطرہ ہے جسے وہ اپنی گہری شیطانی سازشوں سے ٹالتے آئے ہیں۔

خلافت عثمانیہ کو تہہ تیغ کرنے کے لیے کی گئی گھناؤنی سازشوں کا پیچیدہ جال ہو یا پھر مسلم دنیا کو مغربی رنگ میں رنگنے جانے کی مسلسل دجالی کاروائی، اور یا پھر ۱۹۴۷ء سے بھی قبل نافذ شدہ لارڈ میکالے کا تعلیمی نظام، یہ سب ایک ہی ’بڑے منصوبے‘ کی چیدہ چیدہ اکائیاں ہیں۔ دور کیا جائیں وطن عزیز کی ۲۷ سالہ محدود تاریخ کا ہی جائزہ لیں تو تعجب ہوتا ہے کہ ۲۷ برس گزر جانے کے بعد بھی اس قوم کو ان کی قومی و دینی امنگوں کی ترجمانی کرنے والا تعلیمی نظام نہ دیا جاسکا۔ پاکستان کے پہلے دورِ حکومت سے ہی شعبۂ تعلیم کو اہم نہ گردانا گیا۔ ۱۹۵۶ء تک تو قراردادِ مقاصد پر ہی بحث مباحثہ چلتا رہا اور پھر اللہ کر کے کہیں پاکستان کا پہلا قانونی مسودہ تشکیل پا سکا۔ پھر وہی ہوا جس کے لیے انگریز برسوں پہلے بیج بو کر جا چکا تھا، یعنی مسلسل ایک پست ذہن نام نہاد لیڈران کی بے قیمت کھیپ نکلتی رہی جو دولت کے زور پر آکسفورڈ، کیمرج اور ہارورڈ سے تعلیم حاصل کر کے آتی رہی۔ بجائے اس کے کہ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ وڈیران پاکستان کے نظام تعلیم کو اس کے حقیقی تقاضوں کے ساتھ جدید خطوط پر استوار کر کے تعلیمی انقلاب برپا کرتے، انہوں نے اسے مزید زوال پذیری کے اندھیرے میں دھکیل دیا۔ یہ فارن کوالیفائڈ افراد قومی تشخص و ترقی، نظریاتی فروغ اور اسلامی اقدار کی ناموری کسی بھی حوالے سے اپنی یہ اہم ترین ذمہ داری نبھانے سے نہ صرف قاصر رہے بلکہ مغربی نظام تعلیم سے متاثر قیس مغرب بن کر کشکول تھامے مغربی

ایجنڈے کوفروغ دیتے رہے۔

نصاب تعلیم کے نئے سرے سے اوور ہالنگ کے لیے کی جانے والی حالیہ حکومتی کوششوں کو پھر سے ناکام بنادینے کی گھناؤنی سازشوں نے نہایت شدت سے ایک بار پھر سر اٹھالیا ہے۔ اسلامی نظریاتی مملکت خدداداپاکستان کا نظریاتی تشخص دراصل اس کے تعلیمی نظام سے ہی منسلک ہے۔ اب تک غیر ملکی ایجنڈے پہ پنپنے والا کمزور تعلیمی نظام آج تک اس ملک کو اس کی اصل شناخت نہ دے سکا۔ ان دونوں اکائیوں کے بیچ موجود یہ درمیانی فاصلہ اتفاقاً نہیں بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رکھا گیا، اور یہی کوشش آج کل بھی زوروشور سے جاری ہے۔

سپریم کورٹ کی ۲۰۱۴ء کی دی گئی ہدایات کے مطابق غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف نصابات میں موجود کسی بھی قسم کا مواد حذف کرنے کا حکم نامہ جاری ہوا، باوجود اس کے کہ شاذ ہی ایسا کوئی قابل اعتراض مواد موجود تھا۔ اس حکم نامے کے عین مطابق نصابات کی اصلاح بخوبی کی جاچکی ہے۔ اصولاً یہ معاملہ یہیں ختم ہوجانا چاہیے تھا مگر اس کے پیچھے سرگرم لابی اگلے سے اگلا محاذ کھولے جارہی ہے۔ دراصل معاملہ اقلیتوں کے تعلیمی حقوق کی پامالی کا نہیں بلکہ اس کی آڑ میں پاکستان کی ۹۷-۹۸ فیصد اکثریت کو ان کے تعلیمی ونظریاتی مقاصد کے حصول میں ناکام بنانا ہے۔ یہ عشق علیؓ نہیں بلکہ بغض معاویہؓ جیسا معاملہ ہی ہے۔ اقلیتی ہیومن رائٹس کی آڑ میں یہی لابی ایک بار پھر اس قوم کی آگے آنے والی نسلوں کی تقدیر سے پیشگی کھلواڑ کا مضبوط ارادہ رکھتی ہے۔

اقلیتی حقوق کمیشن، ہیومن رائٹس کی آڑ میں مسلم اکثریتی حقوق کو پس پشت ڈال کر تعلیمی نصابات کو قومی نظریاتی روح سے مکمل طور پر عاری کرنے کے ایجنڈے پر عمل درآمد کا بھرپور طریقے سے ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں اور افراءتفری کا ماحول بناتے ہوئے پاکستانی اربابِ اختیار سے عجلت میں فیصلے کروانے کی انتھک کوشش کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں پنجاب میں صرف شعیب سڈل پہ مشتمل یک رکنی کمشن بنا کر اس ایجنڈے کی فوری تکمیل، کیا کسی بھی زاویے سے انصاف پہ مبنی کاروائی ہے! ذمہ دار افراد کو ہوش کے ناخن لینے کی اشد ضرورت ہے۔ انہیں چاہیے کہ شعور کی آنکھ سے اس مسئلے کو جانچیں اور ان بے وزن مطالبات کو حقائق کی کسوٹی پے پرکھیں کہ اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے نصابات سے اللہ، رسول، اور دیگر اہم شخصیات ومعلومات کو

نکالنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایسا سوچنا بھی دراصل اس مملکت کے وجود سے انکار کے مترادف ہے۔ قانون کی متعلقہ شقیں اٹھا کر دیکھیں تو انہیں اپنا قبلہ درست کرنے میں ضرور آسانی محسوس ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی بھی آزاد ریاست کے تعلیمی نصابات اور تدریسی مواد سے اس ملک کی تاریخی، نظریاتی، اخلاقی، ثقافتی، مذہبی اور قومی تشخص منعکس نہ ہوتا ہو۔ یہ بھی کس طرح قابل قبول ہوسکتا ہے کہ کسی ملک میں بسنے والی اکثریت ہندو، عیسائی، یہودی، پارسی یا سکھ ہو اور ان کی درسی کتب میں محمد، احمد، حامد، خدیجہ، آمنہ، طاہرہ جیسے کرداروں کو کہانیوں میں زیر بحث لایا گیا ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی ملک کا قومی و مذہبی لباس، اقدار و روایات انہی مذاہب سے مطابقت رکھتے ہوں لیکن اس کے برعکس ان کے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی کتب اپنے طلباء میں ان کے قومی و مذہبی مواد کے بجائے اسلامی شعائر، روایات وعبادات کے متعلق شعور منتقل کرتی ہوں۔ اگر غیر مسلم ریاستوں میں یہ قابل عمل اور ممکن نہیں تو ایک اسلامی ریاست میں اس کے اپنے افکار ونظریات کے برعکس تعلیمی حاصلات کی بنیاد رکھنا کیونکر ایک دانشمندانہ فیصلہ ہوگا؟ ہاں لیکن اس اصول کے برعکس پاکستانی سرکاری ونجی تعلیمی اداروں میں درسی کتب کے ذریعے پاکستانی طلباء کے ساتھ ضرور یہ کھلواڑ کیا جاتا رہا ہے۔

اقلیتی حقوق اور ہیومن رائٹس کی آڑ میں یہ غیر فطری مطالبہ کئی برسوں سے کیا جاتا رہا ہے۔ ایک بار پھر اس کے ذریعے اغیار کا پرانا دیرینہ خواب برائے زوال اسلام پورا کرنے کی مذموم کاوش کو خدانخواستہ ملکی تاریخ کے بہت اہم مگر غیر منصفانہ فیصلے کی طرف زبردستی دھکیلا جا رہا ہے۔ ہم چاند ستارے والے پرچم کے سائے میں بسنے والی ایک قوم طلوعِ اسلام اور فروغ ارکان اسلام کی طرف فیصلہ کن اور مدلل پیش رفت چاہتے ہیں۔ ہم اپنے اقلیتی ہم وطنوں سے بھی اظہار محبت کرتے ہیں اور پہلے کی طرح اب بھی ان کے ساتھ ان کے جائز حقوق کے حصول کے لیے کھڑے ہیں۔ ہم ان نام نہاد انسانی حقوق کے علمبرداروں کی پاکستانی نظام تعلیم کی بہتری کا عمل روکنے کے لیے کیے جانے والے مجرمانہ اقدام کے خلاف ایک قوم کی طرح متحد ہیں، اور ان سازشوں کی بیخ کنی کی شدت سے منتظر ہیں۔

اسلام اور پاکستان مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

نیا اوقاف ایکٹ ۔ خلافِ شریعت وخلافِ آئین ہے

حال ہی میں حکومت پاکستان نے فیٹف کے دباؤ پر پہلے اسلام آباد کے لیے نیا اوقاف ایکٹ پاس کروالیا اور اس کے بعد ساری صوبائی اسمبلیوں سے بھی انہی خطوط پر قانون سازی کروالی گئی۔ یہ قوانین اگر بالفعل نافذ کردیے جائیں تو دوسرے نقصانات کے علاوہ مساجد اور مدارس کے موجودہ نظام کا قائم رہنا بہرحال خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس لحاظ سے یہ انتہائی سنجیدہ اور حساس معاملہ ہے اور ملک بھر کی دینی جماعتیں اس کے خلاف آواز اُٹھارہی ہیں۔

دینی مدارس کے وفاقوں کے "اتحاد تنظیماتِ مدارس دینیہ" کے وفد نے، جن میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بھی شامل تھے، جب سپیکر قومی اسمبلی اور وفاقی وزراء سے ملاقات کی تھی تو سپیکر صاحب نے کہا کہ آپ کی رائے میں اس قانون کے جو پہلو خلافِ شریعت ودستور ہیں آپ ان کی نشاندہی فرمادیں تو ہم انہیں بدلنے کی کوشش کریں گے۔ اس پر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے مبسوط علمی مقالہ مرتب فرمایا اور اُسے باقاعدہ بل کی شکل میں بھی حکومت کو پیش کیا ہے۔ مولانا کے مضمون کا متن یہ ہے:

دفعہ 2(سی)

"منتفع مالک" کی تعریف قرآن وسنت کے منافی ہے۔ وقف کی ملکیت نہیں ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس کی ملکیت منتقل کی جاسکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کے وقف کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ:

"فان النبی صلی الله علیه وسلم ﷺ قال لعمر فی وقفه: لا یباع أصلها، ولا یبتاع، ولایوهب، ولا یورث. قال الترمذی: العمل علی هذا الحدیث عند أهل العلم من أصحاب النبی ﷺوغیرهم، لا نعلم بین أحد من المتقدمین منهم فی ذلك اختلافًا. (المغنی لابن قدامة.)

اس کی غیر منقولہ جائیداد کی اصلیت نہ تو بیچی جاسکتی ہے اور نہ ہی خریدی جاسکتی ہے، نہ عطیہ کی جاسکتی ہے اور نہ ہی وراثت میں مل سکتی ہے۔امام ترمذی فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کے اہل علم صحابہ کرام اور دیگر علمائے کرام نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ہمیں متقدمین علمائے کرام کے مابین اس معاملے میں کسی بھی اختلاف کے بارے میں معلومات نہیں ہیں"۔

یہاں تک کہ وقف کسی بھی شخص کی منتفع ملکیت میں نہیں ہوسکتا کیونکہ منتفع مالک کو جائیداد سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوتا ہے۔اس کے برعکس، وقف سے مستفید ہونے والے مستحقین ہی ایسے افراد ہیں جن کے فائدے کے لیے وقف تشکیل دیا گیا ہے۔

دفعہ 2(این)، وضاحتیں 3 اور 4

وقف کی ملکیت والے فنڈز سے خریدی گئی جائیداد خود وقف نہیں ہے، بلکہ یہ ایسی جائیداد ہے جو واقف کی ملکیت میں ہے۔یہ قضیہ وقف اراضی سے حاصل ہونے والی آمدنی یا پیداوار کے معاملے سے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے، مثال کے طور پہ: یہ آمدنی یا پیداوار وقف کی ملکیت میں ہے اور وقف آمدنی مستحقین کو دی جاتی ہے یا ان پر خرچ ہوتی ہے۔اگر یہ آمدنی یا پیداوار خود وقف ہوتی تو یہ آمدنی مستفید افراد کی ملکیت میں دینے اور اسے استعمال کرنے کی اجازت نہ ہوتی کیونکہ وقف املاک کے وجود کو محفوظ رکھنا ضروری ہے اور اِسے استعمال کر کے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ وقف سے فائدہ اٹھانے والوں کو یہ آمدنی دینے کے بجائے، اگر وقف کی دستاویزات اِس چیز کی اجازت دیں کہ وقف سے یہ آمدنی کسی چیز یا جائیداد کی خریداری کے لیے استعمال ہونے دی جائے تو یہ جائیداد وقف نہ ہوگی، بلکہ یہ ایسی جائیداد ہوگی جس کا مالک واقف خود ہے، اور اسے وقف دستاویزات میں موجود طریقہ کار/ ہدایات کے مطابق تصرف کرنے کی اجازت ہے۔اسی چیز کا اطلاق وقف کے چندہ کے ڈبے کے ذریعے حاصل کردہ صدقہ پر ہوتا ہے۔فتاوی عالمگیری میں ہے۔

رجل أعطى درهما فى عمارة المسجد أو نفقة المسجد أو مصالح المسجد صح، لأنه وإن كان لا يمكن تصحيحه تمليكا بالهبة للمسجد

فإثبات الملك للمسجد على هذا الوجه صحيح فيتم بالقبض، كذا في الواقعات الحسامية. الفتاوى الهندية (2/ 460)

دفعہ 3(1)

اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ وقف املاک چیف کمشنر، آئی سی ٹی کے زیر اختیار(VEST مفوضہ) ہوں گی۔ عام استعمال میں جب کسی شخص کو کسی پراپرٹی میں "(VEST) زیر اختیار یا مفوضہ" کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کا مالک ہے جبکہ وقف املاک کسی بھی شخص کی ملکیت نہیں ہو سکتی، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ تاہم، اگر اسے "اتھارٹی" کے معنی میں لیا جاتا ہے تو لفظ "(VEST) زیر اختیار یا مفوضہ" کے اس بے ساختہ استعمال کو آسانی سے قرآن وسنت کے قوانین کے خلاف چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو وقف املاک سے لطف اندوز ہونے اور اس کے تصرف کا حق دینے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بلیکس لاء ڈکشنری کے مطابق: تفویض (vest) کرنے کا مطلب ہے:

''ایک طے شدہ اور نا قابل شناخت حق دینا ہے۔ ایک جائیداد کا قبضہ تفویض (Vested In Possession) ہونے کا مطلب جب وہاں حال میں اس جائیداد سے لطف اندوز ہونے کا حق موجود ہو۔ اور کسی جائیداد کے مفاد تفویض (Vested in Interest) کرنے کا مطلب اس جائیداد سے مستقبل میں لطف اندوز ہونے کا موجودہ مستقل حق ہے۔''

مریم ویبسٹر کی لغت نے ''تفویض (vest)'' کی وضاحت اس طرح کی ہے:

الف: کسی نام اتھارٹی،، یا جائیداد کو 10 سال کی خدمت کے بعد پنشن فوائد والے کارکنوں کے پاس رکھنا یا اس کا اختیار دینا۔

ب: کسی شخص یا اتھارٹی کے قبضہ یا اختیار میں رکھنا یا دینا: خاص طور پر کسی ایسے فرد کو دیا جو قانونی طور پر کسی مستقل حق (جیسے کوئی جائیداد) سے حال یا مستقبل میں لطف اندوز ہونے کا حق رکھتا ہو۔

دفعہ 3(2) اور (3)

یہ ذیلی حصے ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ذیلی دفعہ (2) میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ چیف ایڈمنسٹریٹر مسلمان ہو اور بی ایس 19 کا سرکاری ملازم ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ چیف ایڈمنسٹریٹر ایک فطری فرد ہو۔ دوسری طرف ذیلی دفعہ (3) میں یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف آئی سی ٹی ای ''واحد کارپوریٹ ادارہ'' ہوگا، جس کا مطلب ہے کہ یہ قدرتی فرد نہیں ہوگا۔ ایکٹ میں ''واحد کارپوریٹ ادارہ'' کی واضح تعریف کی عدم موجودگی میں عدالتوں کے ذریعہ نافذ ہونے والی سب سے زیادہ ممکنہ تعریف کمپنیز ایکٹ 2017ء کی ہوگی، جس میں کہا گیا ہے کہ: ''کارپوریٹ'' یا ''کارپوریشن'' شامل ہیں۔

(a) ایک کمپنی جو اس ایکٹ یا کمپنی قانون کے تحت تشکیل پائے۔ یا

(b) پاکستان سے باہر تشکیل شدہ کمپنی، یا

(c) ایک قانونی ہیئت جس کو متعلقہ قانون میں کمپنی قرار دیا گیا ہو لیکن (حسب ذیل) اس میں شامل نہیں ہے۔

I۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں سے متعلق کسی بھی قانون کے تحت رجسٹرڈ ایک کوآپریٹو سوسائٹی

II۔ کوئی دوسرا ادارہ جو نفاذ کے وقت اس ایکٹ یا کسی دوسرے قانون میں کمیٹی کی تعریف پر پورا نہیں اترتا، جسے وفاقی حکومت کے متعلقہ وزیر انچارج نوٹیفکیشن کے ذریعے، اس کی طرف سے اس کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

اگر مذکورہ بالا تعریف کے مطابق (واحد کارپوریٹ ادارہ) کے الفاظ کی (c) کے مطابق تشریح کی جائے تو اس کارپوریشن کو کمپنیز ایکٹ کے تحت بنایا جائے گا۔ جو (کمپنیز ایکٹ) واضح طور پر یہ شرط نہیں رکھتا کہ کسی کمپنی کا فیصلہ ساز مسلمان ہونا ضروری ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کارپوریشن کو باقاعدگی سے واضح کرنے والے اصولوں کی عدم موجودگی میں اور جو لوگ اس کو چلاتے ہیں، تمام متاثرہ عوامی اسٹیک ہولڈرز کے ذریعے اس کی

باقاعدگی سے جانچ پڑتال کی ضرورت کو پیش نظر رکھے بغیر، اس سیکشن (دفعہ) نے قانون میں ایک خطرناک خلا چھوڑ دیا ہے اور اس قانون کے غلط استعمال کے دروازے کھول دیے ہیں۔

دفعات 6، 7، 21، 9، 21، 22، 23 کے ساتھ 26 اور 27

ان دفعات کا تقاضا ہے کہ وقف املاک کو مستقل طور پر رجسٹرڈ کیا جائے اور یہ کہ تمام رجسٹرڈ یا غیر رجسٹرڈ وقف کی وہ تمام معلومات فراہم کریں جس کی حکومت کو وقتاً فوقتاً ضرورت ہو سکتی ہے۔

اسی طرح ان دفعات میں مخصوص مذہبی سرگرمیاں جاری رکھنے کی ہدایت اور خطبات میں مخصوص مواد کی تشہیر کی پابندی لگانے کا حکومت کو اختیار دیا گیا ہے۔ اس قسم کے اقدام سے آزادی اظہار کا آئینی حق مجروح ہوگا، بشرطیکہ وہ آزادیِ اظہار قرآن وسنت کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہ ہو۔ دفعہ 26 اور 27 میں عائد کی جانے والی غیر انسانی سزاؤں یعنی پانچ سال تک قید اور 25 ملین روپے تک جرمانہ کے اطلاق سے اس کی سنگینی میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

جہاں تک رجسٹریشن اور معلومات جمع کرنے کے معاملے کی بات ہے تو اس حوالے سے دینی مدارس کے حالیہ تجربات (جن میں اکثریت وقف ہیں) یہ ہیں کہ اس مسئلہ کو کلی طور پر حکومت کی من مانی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے اور پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے متعدد بار غلط استعمال ہوتے ہوئے ان اداروں کی انتظامیہ کو ہراساں کرنے اور بلا جواز مطالبات کرنے کا آلہ کار ثابت ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس طرح کے قوانین کبھی بھی پائیدار ثابت نہیں ہو سکیں گے جب تک کہ حکومت رجسٹریشن اور معلومات طلب کرنے والے معاملات کی طرح اتحاد تنظیمات مدارس جیسی نمائندہ تنظیم کو اوقاف آئی سی ٹی میں شامل نہ کرے۔

دفعہ 8 اور 14

یہ دفعہ چیف ایڈمنسٹریٹر کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ نوٹیفکیشن کے ذریعے وقف املاک کا انتظام سنبھال سکتا ہے، اسے کنٹرول، اس کو منظم اور اس کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ اس استثناء کے علاوہ کہ واقف رضامندی سے اپنی زندگی میں ایسا کرنے کی اجازت دے (اس صورت کے علاوہ) اس کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اولاً: یہ شریعت کے منافی ہے اگر واقف نے اپنے وقف کے لیے کوئی ''متولی'' مقرر کیا ہے تو اس کی تقرری کی ضرور تکریم کی جائے، جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس نے جائیداد کا غلط استعمال یا نامناسب استعمال کیا ہے یا اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے۔

ثانیاً: یہ کہ چیف ایڈمنسٹریٹر کو اس طرح کے غیر محرف و بے محل اختیارات دینا، اختیارات کے ناجائز و نامناسب استعمال اور بصد معذرت رشوت ستانی کے دروازے کھولنے کے مترادف ہے۔ ہمارے ملک کی موجودہ صورتحال کوئی راز نہیں ہے، حکومت وقت کو وقف املاک پر اپنی مرضی وصوابدید سے قبضہ کرنے کی اجازت دینا یقینی طور پر ان مقاصد کو نقصان پہنچائے گا جن کے لیے یہ قدیم اوقاف قائم ہوئے تھے۔

یہ اوقاف صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور منتظمین کی خوبی سے آسانی سے چلتے رہیں گے جن پر واقف نے صریح یا عیاں طور پر اپنا بھروسہ کیا ہے۔

بہت سے وقف ایسے ہیں جن کے منتظمین کی واقف نے ایک خاص مزاج اور اس بات کی تفہیم کے ساتھ پرورش کی تھی کہ وہ واقف کی خواہش کے مطابق وقف کا انتظام کریں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وقف سے فائدہ اٹھانے والے نمازی، طلبہ یا کوئی دوسرا فرد جسے وقف میں دلچسپی ہو، تو وہ حکومت وقف کے بجائے واقف کے مقرر کردہ وقف منتظمین پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں، اس لیے اس معاملہ میں کسی قسم کا اشتعال پبلک سیفٹی کے لیے خطرہ پیدا کر سکتا ہے۔

لہٰذا یقینی طور پر یہ خود حکومت کے بہترین مفاد میں بھی نہیں ہے کہ وہ اس طرح کے اقدامات مسلط کر کے اس ملک کے شہریوں کی نظروں میں اپنے آپ کو مزید بدنام کرے۔ حکومت کی صوابدیدی طاقت کو دفعہ 14 کے ذریعہ مزید تقویت ملتی ہے جو تنازعات کے حل ہونے تک چیف ایڈمنسٹریٹر کے خلاف عارضی طور پر پابندی کا حکم جاری کرنے کے لیے مجاز عدالتوں کے اختیارات چھین لیتی ہے۔

یہ بات عیاں ہے کہ کوئی بھی معقول فرد یہ جاننے سے قاصر ہے کہ قرآن وسنت کی اعلیٰ اتھارٹی کے تابع جمہوری مملکت کا دعویٰ کرنے والے ملک میں ایسے غیر جمہوری قوانین کیسے نافذ کیے جا سکتے ہیں۔

دفعہ 10

''غلط قبضے'' کے فیصلے کو غیر جانبدار دارالافتا جس پر وقف کے مستحقین بھروسہ کرتے ہوں اور وہ وقف میں کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو، فتویٰ کی صورت میں ماہرین کی تحریری رائے سے مشروط کرنا چاہیے۔ اسی طرح، اسلامی نظریاتی کونسل سے بھی ماہرانہ رائے لی جانی چاہیے۔ یہ فیصلہ حکومت کی صوابدید پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اسی طرح، اگر چہ ملکیت ثابت ہوجاتی ہے تو پھر ناجائز مالک کی جانب سے کاشت کی گئی فصلوں یا تعمیر شدہ عمارت کی حکومت قرقی نہیں کرسکتی۔ بلکہ فصلوں کو واپس کرنے یا عمارت کو منہدم کرنے کے طریقے پر اسی دارالافتاء سے فتویٰ طلب کیا جانا چاہیے، اور اسی وقت غلط مالک کے قبضہ خاتمے میں ہونے والے اصل اخراجات کی وصولی کی جائے۔

دفعہ 11(2)

معاوضہ غیر جانبدار ماہرین کے ذریعہ طے کیا جانا چاہیے اور یہ صرف اصل اخراجات تک ہی محدود ہونا چاہیے۔

دفعہ 17

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صریح حکم جو مندرجہ بالا دفعہ 2(c) کے نوٹ میں مذکور ہے کے مطابق عام حالات میں وقف املاک کی فروخت ہرگز جائز نہیں ہے۔ تاہم، کچھ سنگین اور غیر معمولی حالات میں، جیسے جب وقف کا علاقہ مکمل طور پر ویران ہوجائے، جس میں اب وہ خدمت جاری رکھنا ممکن نہ ہو جس خدمت کے لیے وہ وقف قائم کیا گیا تھا ایسی صورت میں وقف املاک فروخت کی جاسکتی ہیں اور اس فروخت سے حاصل شدہ رقم سے اسی مقصد کے لیے اسی طرح کی پراپرٹی خریدی جائے گی۔ (مثال کے طور پر، AAOIFI، معیارات 33، آرٹیکل 9، شرعی معیارات ملاحظہ کریں۔) لہٰذا، اس حصے کے لیے اختیارات بھی غیر جانبدار ماہرین اور اسلامی نظریاتی کونسل کی وضاحت کے مطابق قرآن وسنت کے قوانین کے تابع ہونے چاہئیں۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ذیلی دفعات 1(f)، (g) اور 2 مذکورہ بالا حدیث کے براہ راست متضاد ہیں۔

دفعہ 18 اور 19

یہ دفعات چیف ایڈمنسٹریٹر کو یہ اختیار فراہم کرتے ہیں کہ وہ وقف سے حاصل ہونے والی آمدنی کو "اسلام کے کسی ایسے مسلمہ نیک، مذہبی یا خیراتی مقصد کے لیے جیسا کہ چیف ایڈمنسٹریٹر مناسب سمجھے" استعمال کرسکتا ہے۔ وقف آمدنی کے اخراجات کا حقیقی مصرف وقف سے مستفید ہونے والے مستحقین ہیں جو واقف کے ذریعہ مقرر کیے گئے ہوں یا جن کو خود وقف نے بحال رکھا ہو۔ جب یہ ابہام ہوتا ہے کہ مستفید ہونے والے کون ہیں تو جائزہ لینے کے لیے اس معاملے کو غیر جانبدار ماہرین کے پاس بھیجنا ہوگا۔ اس بات کا تعین کرنا کہ وقف کی آمدن کہاں خرچ ہو چیف ایڈمنسٹریٹر کا دائرہ اختیار نہیں ہے۔

دفعہ 20

یہ دفعہ ناقابل ادا وقف املاک کے کرایہ کی وصولی کو لینڈز ریونیو ایکٹ، 1967ء کے بقایاجات کے قوانین سے مشروط کرتا ہے۔ تاہم، لینڈز ریونیو ایکٹ کا اس طرح کا استعمال دانشمندانہ نہیں ہے، کیونکہ وقف املاک کے اپنے مخصوص حالات ہیں۔ لینڈز ریونیو ایکٹ کے نامناسب ہونے کی صرف ایک مثال یہ ہے کہ اس ایکٹ کی دفعہ 80 اجازت دیتی ہے کہ وہ زمین میں جس کے بقایاجات واجب الادا ہوں تو اسے ان بقایاجات کی وصولی کے لیے بیچا جاسکتا ہے، جو ظاہر ہے کہ آئی سی ٹی وقف پراپرٹیز بل کے تحت کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دفعہ 24

یہ دفعہ آئین سے سراسر متضاد ہے جو کسی بھی ایسے اقدام کی اجازت نہیں دیتا جو قانون کی گرفت سے مستثنٰی ہو۔

دفعہ 28

چیف ایڈمنسٹریٹر کے ذریعہ وضع کردہ قواعد کو قرآن وسنت اور آئین وانسانی حقوق کے ماہرین کی مناسب جانچ پڑتال کے ساتھ مشروط کیا جائے تاکہ ان قواعد میں بھی موجودہ بل کی غلطیاں دہرائی نہ جائیں۔

اسلام اور پاکستان　　ڈاکٹر محمد امین

اسٹیبلشمنٹ اور تحریک لبیک

چند چبھتے ہوئے سوالات جن پر غور ضروری ہے

* اسٹیبلشمنٹ کیوں مذہبی جماعتیں اور گروہ پالتی اور پھر انہیں کچل دیتی ہے؟
* ہماری مذہبی جماعتیں اور گروہ کیوں یہ "دانہ" چگ لیتے ہیں اور پھر ذلیل و رسوا ہوتے ہیں؟
* شدت پسند مذہبی گروہ کیوں وجود میں آتے ہیں؟

اکثر لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ واقعات اور مظاہر پر گفتگو کرتے ہیں لیکن ان کے پیچھے چھپے اسباب وعلل پر غور نہیں کرتے۔ مثلاً ہر مذہبی آدمی اور مذہبی جماعت و گروہ ان دنوں کالعدم تحریک لبیک کے کارکنوں پر حکومتی ظلم وستم کی مذمت کر رہا ہے۔ یہ صحیح ہے، اور ہم بھی حکومتی رویے کی مذمت کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ یہ سانحہ کیوں پیش آیا اور اس سے کیسے بچا جا سکتا تھا؟ ہم یہاں واقعات پر بحث کی بجائے ان کے پس پردہ محرکات وعوامل پر گفتگو کریں گے۔ اور اوپر اٹھائے گئے تینوں سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

پہلے سوال کی طرف آیئے۔ ہماری تفہیم کے مطابق 'ڈیپ سٹیٹ' یا اسٹیبلشمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ اس کے پیش نظر ریاست پاکستان کا دور رس مستقبل اور سیکورٹی مفادات ہیں جنہیں بعض اوقات کم نگاہ سیاسی جماعتیں اور مذہبی گروہ اہمیت نہیں دیتے لہٰذا ریاست کے وسیع تر اور دور رس مفادات کی خاطر اسے بعض اوقات غیر معمولی اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ ہم بطور مفروضہ ایک لمحے کے لیے اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں (اگرچہ جمہوریت پسندوں کو ہمارا یہ مؤقف بہت فضول اور غلط لگے گا کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک چلانا اور اس پر حکومت کرنا منتخب سیاسی نمائندوں کا کام ہے اور فوج کا کوئی سپہ سالار جب ملک پر قبضہ کرتا ہے تو وہ ذاتی ہوس اقتدار کی وجہ سے کرتا ہے) کہ ڈیپ سٹیٹ اور اسٹیبلشمنٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاست کے مفاد کے نام پر روٹین سے ہٹ کر غیر معمولی (اور بعض اوقات غیر آئینی) اقدامات کرے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ کیا 'ڈیپ سٹیٹ' کی اس روش کی کوئی لیمٹ (Limit) بھی ہے؟ یا ہونی چاہیے؟ یا اس بہانے کو سامنے رکھ کر وہ جو چاہے، جب چاہے کرتی پھرے۔ بلا حدود آزادی (Limitless Freedom) تو محض اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے۔ لہٰذا ڈیپ سٹیٹ یا اسٹیبلشمنٹ کو کچھ حدود وقیود طے کر لینی چاہئیں۔

تفصیلات سے قطع نظر اسٹیبلشمنٹ کا بنیادی ہدف ہونا چاہیے: ریاست اور اس کی جغرافیائی ونظریاتی حدود کا تحفظ اور استحکام۔ چونکہ ہر ریاست کسی نہ کسی نظریے پر کھڑی ہوتی ہے اس لیے ریاست کے وجود اور اس کی جغرافیائی حدود کا تحفظ ہو نہیں سکتا جب تک اس کے نظریے کی حفاظت نہ کی جائے۔ اب ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان جس اصول پر بنایا گیا تھا وہ دوقومی نظریہ تھا اور نظریۂ پاکستان، اسلام کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیا ہماری اسٹیبلشمنٹ نے اس بات کو حرز جان بنایا ہے؟ کیا اس نے ریاست کے اسلامی کردار کی مؤثر حفاظت کی ہے؟

اسی طرح ایک انتہائی اہم ، بنیادی اور ناقابل انکار پہلو یہ ہے کہ مغرب اسلام کا اور مسلمانوں کا اور خاص کر پاکستان کا دشمن ہے تو ہماری اسٹیبلشمنٹ نے مغرب کی پرامن مزاحمت کا اور پاکستان کو مغرب کی سازشوں اور اس کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے اثرات بد سے بچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ میری دیانت دارانہ اور بے لاگ رائے یہ ہے کہ ہماری اسٹیبلشمنٹ ان دو بنیادی ترین محاذوں پر کماحقہ کام نہیں کر سکی اور نہیں کر رہی۔ اس کا حل کیا ہے؟ میری تجویز یہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز یا انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹیجک سٹڈیز میں ایک پرمانٹ ''نیشنل کونسل آف سٹریٹیجک سٹڈیز'' قائم کرے جس میں ہر شعبۂ زندگی سے اعلیٰ دماغ اور بلند سوچ رکھنے والے محب اسلام ومحب پاکستان دانشوروں کو جمع کرے۔ اس کے سارے اجلاس ان کیمرہ ہوں۔ کئی کئی دنوں کی طویل نشستیں ہوں۔ آزادیٔ فکر کا اہتمام ہو۔ سوچ اور اظہار پر پابندی نہ ہو۔ اسٹیبلشمنٹ اس کونسل سے رہنمائی لے کر اپنا روڈ میپ بنائے۔

مقامی محاذ اور سیاسی جوڑتوڑ میں اسٹیبلشمنٹ کا کردار دینی حوالے سے کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتا اور لوگ اسے فوجی جرنیلوں کی ہوس اقتدار یا اپنے ادارے کی بالادستی جنگ سمجھتے ہیں۔ جنرل ضیاء نے کراچی کی دینی قوتوں کو کمزور کرنے کے لیے ایم کیو ایم بنوائی۔ بھٹو کو ناکام کرنے

کے لیے آئی جے آئی میں دینی قوتوں کو شامل کیا۔ جنرل مشرف نے علاج بالمثل کے منہج پر ایم ایم اے بنوایا، انہیں نشستیں جتوائیں، سرحد میں انہیں حکومت بنانے دی اور مرکز میں مولانا فضل الرحمن کی فرینڈلی اپوزیشن کو پارلیمنٹ میں آئینی ترمیم کے ذریعے اپنی حکومت کو لیگل کوردینے کے لیے استعمال کیا۔

ایرانی حمایت یافتہ سپاہ محمد کے مقابلے میں سپاہ صحابہ بنوائی اور لشکر جھنگوی کو کھڑا کیا۔ پھر وقت گزرنے کے بعد اسے ٹھکانے لگا دیا۔ جہاد افغانستان کے لیے جماعت اسلامی کو استعمال کیا۔ جہاد کشمیر کے لیے لشکر طیبہ بنوایا اور اب وہی حافظ سعید جیلوں میں سڑ رہا ہے اور اس کی ''دہشت گرد جماعت'' پر پابندی ہے۔ نواز شریف کا ووٹ بنک توڑنے کے لیے تحریک لبیک بنوائی اور اب اس کے نوجوانوں پر سیدھی گولیاں چلائی جا رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ اقتدار کا اندھا کھیل ہے یا اس کے پیچھے کوئی اصول وضوابط ہیں؟ اور اگر نہیں ہیں تو کیا بنائے جا سکتے ہیں؟

دوسرا سوال

اب آیئے دوسرے سوال کی طرف۔ اسٹیبلشمنٹ تو چلو اپنے مفاد کے لیے جو چاہے کرتی ہے سوال یہ ہے کہ ہماری مذہبی جماعتیں اور گروہ کیوں ہنسی خوشی ان کے جال میں پھنستے ہیں اور پہلوں کا حشر دیکھ کر بھی عبرت نہیں پکڑتے۔ آئی جے آئی میں دینی جماعتیں شامل تھیں اور استعمال ہوئیں۔ ایم ایم اے (جماعت اسلامی وجمعیت علماء اسلام (ف) ودیگر) استعمال ہوا۔ سپاہ صحابہ استعمال ہوئی، جماعت الدعوہ استعمال ہوئی، دفاع پاکستان محاذ اور تحریک لبیک استعمال ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ ان دینی گروہوں اور جماعتوں کی قیادت کا اخلاص اور ان کی فراست کہاں سوئی ہوئی تھی بلکہ اب بھی کہاں سوئی ہوئی ہے؟ اگر کوئی کہے کہ دولت، منصب اور شہرت کے لالچ میں دینی قائدین نے یہ سب کچھ کیا تو پھر تو یہ دین کو مونڈ دینے والی بات ہے۔ بیچارہ اسلام کدھر گیا؟

اسٹیبلشمنٹ چونکہ معاشرے اور ریاست کے دینی تقاضوں کا لحاظ نہیں کرتی لہٰذا اس کی ایک سٹرٹیجی یہ ہے کہ علماء اور دینی جماعتوں کو آپس میں لڑاتے رہو، مسلک پرستی اور فرقہ واریت کو ہوا دو تاکہ وہ کمزور رہیں اور اسٹیبلشمنٹ کے لیے خطرہ نہ بنیں۔ سوال یہ ہے کہ علماء اور دینی

جماعتوں کو اس کی سمجھ کیوں نہیں آتی اور وہ اس کا حل کیوں نہیں نکالتیں؟ مسلک کی بنیاد پر مسجدیں الگ، مدرسے الگ، ان کے وفاق الگ، دینی سیاسی جماعتیں الگ، دینی اصلاحی جماعتیں الگ، آخر علماء کو کیوں نہیں سمجھ آتی کہ یہ سب کچھ اسٹیبلشمنٹ کرا رہی ہے لہٰذا ہمیں یہ سب نہیں کرنا چاہیے؟

تیسرا سوال

آخری سوال یہ تھا کہ شدت پسند مذہبی گروہ کیوں وجود میں آتے ہیں؟

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کے کرتا دھرتا مغربی فکر و تہذیب سے متاثر ہیں اور ترقی و استحکام کے مغربی ماڈل ہی کو اپنانا چاہتے ہیں جس میں دین کا کوئی کردار نہ ہو یا ہو تو تبعی اور ضمنی ہو، مغرب کی اشیر باد سے یا اس کے دباؤ کی وجہ سے کوئی مسلمان حکمران جرأت نہیں کرتا کہ شریعت نافذ کرے۔ علماء و دینی جماعتوں کو متحد ہونے نہیں دیا جاتا تاکہ وہ سب مل کر نفاذ شریعت کا مطالبہ نہ کر سکیں۔ یوں دینی سیاسی جدوجہد کی منزل کھوٹی ہو جاتی ہے اور دین دار جذباتی نوجوان شدت پسند بیانیہ اختیار کر لیتے ہیں۔ حکومتیں اتنی بے حس ہیں کہ وہ کوئی معتدل بات سننے کو تیار نہیں ہوتیں جب تک احتجاج نہ کیا جائے۔ بلکہ بسا اوقات پُرامن احتجاج پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتیں جب تک ہنگامہ آرائی نہ کی جائے، توڑ پھوڑ نہ کی جائے۔ یہ ہمارے ہاں طرز حکمرانی ہے۔ ان حالات میں اگر دین دار نوجوان شدت پسند بیانیے کی طرف لپکتے ہیں تو اس کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔

گویا دین دار نوجوانوں اور جذباتی گروہوں کے وجود میں آنے کی وجہ ہماری اسٹیبلشمنٹ کی انتہا پسندی ہے کہ وہ ہر قیمت پر پاکستان میں مغربی فکر و تہذیب کو نافذ کرنا اور رکھنا چاہتی ہے اور کسی قیمت پر اسلامی شریعت نافذ نہیں کرنا چاہتی اور نہیں ہونے دیتی۔ حالانکہ اگر ہماری اسٹیبلشمنٹ اپنی عقل استعمال کرے، مغرب کی ڈکٹیشن پر نہ چلے اور عوامی امنگوں کے مطابق فرد، معاشرے اور ریاست کو اسلامی اصولوں پر چلنے دے تو ہماری رائے میں شدت پسند مذہبی بیانیہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔

تفہیم دین مدیر

خاموش انقلاب ناگزیر ہے

[یہ سطور اسی عنوان سے ہماری نئی مطبوعہ کتاب کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئیں۔ البرہان میں ان کی اشاعت سے کتاب کے مضامین کا ایک اجمالی تعارف قارئین کے سامنے آجائے گا۔]

'خاموش انقلاب' کا مفہوم

جو بات قرآن وسنت سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے اور جسے آج بھی سارے مسلمان مانتے اور جانتے ہیں بلکہ یہ ہمیشہ سے ان کے ہاں معلوم ومعروف رہی ہے وہ یہ ہے کہ:

- ایک مسلمان کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارے.... خواہ وہ اس کی ذاتی اور انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی یعنی معاشرے اور ریاست میں اس کے کردار سے متعلق ہو۔

- اور یہ کہ وہ اپنی ذاتی اور انفرادی حیثیت میں آخرت میں اللہ تعالیٰ کو اپنے دنیا میں کیے گئے اعمال کے لیے جواب دہ ہوگا۔ اگر دنیا کی زندگی اس نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزاری ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی اور خوش ہوں گے اور اسے جنت کی نعمتوں سے نوازیں گے۔ اور اگر اس نے دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گزاری ہوگی تو وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور عذاب کا مستحق ہوگا۔

- انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزارنے کے لیے کچھ چیزیں ناگزیر ہیں مثلاً:

ایک: یہ کہ ہر مسلمان کی صحیح خطوط پر تعلیم کا انتظام ہو۔ اس تعلیم کا نصاب قرآن حکیم (اور سنت رسول ﷺ) اور علوم حکمت ہوں۔ دعوت، تبلیغ اور میڈیا تعلیم ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

دوم: صرف تعلیم ہی صحیح خطوط پر مبنی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ تربیت بھی ہو، تزکیۂ نفس بھی ہو

تا کہ شخصیت تعلیمِ کتاب وحکمت کے تقاضوں کے مطابق ڈھل جائے، علم پر عمل کرنے کی صلاحیت اور جذبہ انسان کے اندر پیدا ہو جائے۔

سوم: اگر یہ دونوں چیزیں حاصل ہو جائیں تو فرد اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اپنی ذاتی اور انفرادی زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کے مطابق گزار سکے لیکن بعض اجتماعی احکام کے نفاذ کے لیے اور فرد کی تقویت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ اور ریاست بھی اس کی پشت پر کھڑا ہو۔

چہارم: تلخ زمینی حقیقت یہ ہے کہ سارے عالم اسلام میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً ریاست وحکومت مغربی حکمرانوں کے دباؤ میں ہیں اور حکمران اکثر ایسے ہیں جو اسلامی تقاضوں اور عوامی امنگوں کی پروا نہیں کرتے بلکہ مغربی آقاؤں کی ڈکٹیشن پر چلتے ہیں۔ ان حکمرانوں کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ کوشش بھی کرنی چاہیے کہ کسی طرح اسلامی حمیت اور جذبہ والے لوگ برسراقتدار آ جائیں۔ لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا اس وقت تک متبادل طرز عمل یہ ہے کہ وہ بہت سارے کام جو ریاست کرتی ہے، وہ معاشرتی تنظیم سے اور معاشرتی ادارے قائم کر کے کر لیے جائیں جیسے غربت میں کمی، فراہمی عدل وانصاف، بحالیٔ امن وامان، تعلیم کتاب وحکمت، تزکیۂ نفس، صحت کے مسائل کا حل وغیرہ۔

تعلیم وتربیت سے ہونے والی ذہن سازی اور تزکیۂ نفس سے ہونے والی کردار سازی دونوں کام خاموش سے کیے جا سکتے ہیں اور ان کے نتائج بھی خاموشی سے سامنے آ جاتے ہیں یعنی فکر وعمل میں تبدیلی لہٰذا ہم نے انہیں 'خاموش انقلاب' کا نام دیا ہے۔ اسی طرح اگر ریاست وحکومت اپنے حصے کے کام نہ کرے تو ان میں سے بھی بہت سے کام معاشرتی تنظیم سے مسجد کو مرکز بنا کر اور سماجی ادارے بنا کر خاموشی سے کیے جا سکتے ہیں۔

یہ کوئی بہت انہونی اور نئی بات نہیں۔ ہمارے اسلاف نے جب حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو مظلومانہ شہید ہوتے اور سیاسی نظام کی اصلاح ہوتے نہ دیکھی تو انہوں نے تعلیم کتاب وحکمت، تزکیۂ نفس اور فقہ وافتاء کا کام بغیر حکومتی منشا واجازت سے خود کرنا شروع کر دیا اور تب سے یہ کام اسی نہج پر مسلم معاشرے میں جاری وساری ہیں بلکہ آج بھی ہماری

مسجدیں اور مدرسے عوامی حمایت سے، بغیر حکومتی مدد کے، کام کر رہے ہیں اور اس نوع کے کاموں کو مزید توسیع دی جاسکتی ہے۔ یہ کام پہلے بھی خاموشی سے جاری ہیں اور جو مزید کام کرنے ہوں، وہ بھی خاموشی سے کیے جاسکتے ہیں اور کیے جانے چاہئیں لہٰذا ہم نے تعمیر واصلاح فرد اور معاشرتی تنظیم اور اداروں کے ذریعے وقوع پذیر ہونے والی سرگرمیوں اور ان کے نتائج کو 'خاموش انقلاب' سے تشبیہ دی ہے کیونکہ یہ وہ انقلاب ہے جو بغیر شور وشعب، بغیر نعرے لگائے اور بغیر کشت وخون کے برپا کیا جاسکتا ہے۔

مجوزہ خاموش انقلاب کیوں ناگزیر ہے؟

زوال اور سقوط خلافت کے بعد امت مسلمہ کے سامنے دو بڑے چیلنج تھے۔ ایک مغربی استعمار کے شکنجے سے نکلنا اور دوسرے زوال کی دلدل سے باہر آنا۔ ان تحدیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت نے عموماً اور برصغیر کے مسلم مصلحین ومفکرین نے خصوصاً جس حکمت عملی کو اپنایا اسے ہم سہولت بیان کی خاطر یوں بیان کر سکتے ہیں:

انفرادی اصلاح کے لیے

۱۔ دعوتی وتبلیغی سرگرمیاں جیسے تبلیغی جماعت کی جدوجہد

۲۔ دینی تعلیم کے ادارے جنہیں 'دینی مدارس' کہا جاتا ہے

اس طریق کار کے بلاشبہ بہت سے فائدے بھی ہوئے لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار اور تلخ حقیقت ہے کہ مختلف عوامل کی بناء پر (جن میں استعمار کے خلاف ردّعمل اور زوال سے سبق نہ سیکھنا وغیرہ شامل ہیں) اس منہج کے علم برداروں نے اجتماعی زندگی کے تقاضوں سے صَرف نظر کیا اور دین کے ایک محدود تصور کو فروغ دیا جس میں فرد کی ذاتی زندگی میں نماز، روزہ اور داڑھی وغیرہ تو شامل ہو گئے لیکن اجتماعی زندگی (معاشرتی، سیاسی، معاشی، تعلیمی، عدالتی نظام وغیرہ) کے لیے نہ تو افرادی قوت تیار کی گئی اور نہ اس کام کو ہدف بنایا گیا۔

اجتماعی اصلاح کے لیے

۳۔ کچھ جماعتوں نے ریاستی وحکومتی اقتدار کے لیے پرامن سیاسی جدوجہد کا راستہ اختیار

کیا تا کہ اقتدار میں آ کر اس کی قوت سے مذکورہ دونوں چیلنجز سے نمٹا جا سکے اور غلبۂ دین کی چوٹی سر کی جا سکے۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے سیاسی کھیل کے لیے اپنی پچ تیار کرنے اور اس پر کھیلنے پر اصرار کرنے کی بجائے مغربی استعمار کی پچ پر کھیلنا قبول کر لیا جس کے نتیجے میں وہ بہت کم سکور کر سکے اور آؤٹ ہو گئے۔ دینی قوتوں نے مغربی استعمار کے مہیا کردہ سیاسی ڈھانچے (جمہوریت، قومی ریاست، دستور، انتخابات وغیرہ) کو، محض اس میں کتابی طور پر چند اسلامی اصطلاحات داخل کر کے، اسے ’’اسلامی جمہوریت‘‘ کہہ کر قبول کر لیا اور فرد اور معاشرے کو تبدیل کیے بغیر محض اس فریم ورک میں سیاسی جدوجہد سے غلبۂ دین کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو اصولی اور منطقی طور پر نکلنا چاہیے تھا کہ دینی قوتیں ناکام ہو گئیں اور نام نہاد اور برائے نام ’آزادی‘ کے باوجود مغربی استعمار، اس کی پالیسیاں اور اس کی فکر، تہذیب اور اقدار مسلم فرد، معاشرے اور ریاست پر غالب آ گئیں۔

۴۔ کچھ اسلامی حمیت و جذبہ رکھنے والے نوجوان مغربی استعمار کی کامیابی اور اس کے مقابلے میں اس پرامن سیاسی جمہوری انتخابی جدوجہد کے ذریعے اسلامی انقلاب لانے کے خواب کے بکھر جانے سے مشتعل ہو گئے اور انہوں نے ہتھیار اٹھا کر ان غیر صالح مسلم حکمرانوں کے خلاف ’’جہاد‘‘ شروع کر دیا۔ یہ جدوجہد بھی ناکام ہو گئی کیونکہ:

- اکثر جگہ ان جہادیوں میں مغربی استعمار کی خفیہ ایجنسیوں نے داخل ہو کر انہیں استعمال کرنا شروع کر دیا جیسے کہ تحریک طالبان پاکستان اور داعش کے ساتھ ہوا۔

- ان جہادیوں نے فرد اور معاشرے کو سچا مسلمان اور انہیں اپنا حمایتی بنانا ضروری نہ سمجھا بلکہ محض اپنی جہادی قوت کے ذریعے ’اسلامی انقلاب‘ لانا چاہا۔

- وہ اصلاحی و تبلیغی تحریکوں، دینی مدارس اور دینی سیاسی جماعتوں کی حمایت بھی حاصل نہ کر سکے۔ ان سب امور کے نتیجے میں انہوں نے مال و جان کی قربانی تو دی لیکن تبدیلی نہ لا سکے۔

* مذکورہ بالا چاروں گروہوں کے قائدین نے اپنی اختیار کردہ حکمت عملی، جو یقیناً مبنی بر اجتہاد تھی، کو درست اور قرآن و سنت کے عین مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں

ہر ایک نے دین کی ایک مخصوص تعبیر وضع کر لی اور ہر گروہ اپنی تعبیر دین کو 'عینِ دین' اور 'دین کی واحد صحیح تعبیر'' مانتا ہے اور دوسروں سے منوانا چاہتا ہے۔اس چیز نے امت کو دین کے نام پر انتشار وافتراق میں مبتلا کر دیا ہے اور اسے اتحاد واتفاق و یکسوئی سے محروم کر دیا ہے۔

* ہمارا مؤقف یہ ہے کہ پہلے دو گروہوں (اصلاحی وتبلیغی جماعتوں اور دینی مدارس) کی اجتہادی حکمت عملی اور ان کی وضع کردہ تعبیر دین اس لیے ناقص ہے کہ وہ (بجا طور پر) فرد کی اصلاح تو کرتی ہے لیکن اس طرح کرتی ہے کہ معاشرے اور ریاست کی اصلاح اس کا ہدف اور نصب العین نہیں بنتی اور نہ وہ اس کے لیے افرادِ کار تیار کرتی ہے۔لہٰذا وہ پورے دین پر عمل کے حوالے سے ناقص اور ناکام ہے۔

اور ہمارا کہنا دینی سیاسی جماعتوں کے لیے یہ ہے کہ انہوں نے فرد اور معاشرے کی اصلاح کیے بغیر محض سیاسی جدو جہد سے 'غلبۂ دین' اور 'اسلامی انقلاب' لانے کی کوشش کی اور وہ بھی مغربی استعمار کی پچ پر (جمہوریت،قومی ریاست، دستور، انتخابات وغیرہ) پر کھیلتے ہوئے،لہٰذا انہیں بھی ناکام ہونا ہی تھی۔

اور یہی بات ہم جہادیوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ فرد اور معاشرے کی اصلاح کیے بغیر اور دینی قوتوں کی حمایت کے بغیر محض اسلحے کی قوت سے وہ آج کی کسی بھی طاقتور مسلم قومی ریاست کو شکست نہیں دے سکتے جبکہ اس کی پشت پر مغربی استعمار بھی موجود ہے،لہٰذا ان کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔

تلخیصِ بحث

خلاصہ یہ کہ:

۱۔اصلاحی وتبلیغی جماعتیں اور دینی مدارس فرد کی ایسی تعلیم وتربیت کر ہی نہیں رہے جس سے وہ معاشرے اور ریاست کی اصلاح کر کے انہیں اسلام پر عمل کے لیے آمادہ کر سکیں۔

۲۔ جہادی گروہ اور دینی سیاسی جماعتیں فرد اور معاشرے کی اصلاح کرنے، انہیں سچا مسلمان بنانے اور انہیں اپنی حمایت میں کھڑا کرنے کی بجائے محض سیاسی (یا جہادی) قوت سے تبدیلی لانا چاہتی ہیں اور چونکہ غیر صالح مسلم حکمران اور استعماری مغرب بھی ان کے خلاف ہے

لہٰذا نہ وہ کامیاب ہو سکی ہیں اور نہ ریاست کی قوت کو غلبۂ دین اور اسلامی انقلاب کے لیے استعمال کر سکی ہیں۔

وہ یہ سمجھنے میں بھی ناکام ہو چکی ہیں کہ اسلام ''نافذ کرنے'' کی چیز نہیں ''عمل کرنے'' کی چیز ہے اور یہ کام ریاستی قوت کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔

'خاموش انقلاب' کیسے برپا ہو سکتا ہے؟

- خاموش انقلاب اس طرح برپا ہو سکتا ہے کہ فرد کی تعلیم و تربیت اس طرح کی جائے کہ معاشرہ اور ریاست بھی اس کا ہدف ہو۔ فرد اپنی ذاتی زندگی میں ہی اسلام پر عمل نہ کرے بلکہ معاشرے اور ریاست میں اس کا جو کردار ہے وہ وہاں بھی اسلام پر عمل کرے۔

- وہ بہت سے کام (یقیناً سارے نہیں) جو ریاست کرتی ہے، جب ریاست نہیں کر رہی تو وہ معاشرتی اداروں کو منظم کر کے خاموشی سے (ریاست سے ٹکرائے بغیر) کیے جا سکتے ہیں جیسے ہمارے معاشرے میں مساجد و مدارس کا انتظام حکومت کی مدد کے بغیر چل رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے بہت سے کام بھی معاشرتی تنظیم کے ذریعے، معاشرتی ادارے منظم کر کے اور مسجد کو مرکز بنا کر کیے جا سکتے ہیں مثلاً غربت کم کرنے، عدل و انصاف مہیا کرنے، امن و امن کی بحالی، تعلیم، تزکیہ، صحت کی سہولیات.... یہ سارے کام اسلامی تناظر میں پرائیویٹ سیکٹر میں خاموشی سے کیے جا سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ۸۰ فیصد سے زیادہ اسلام پر اس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں ہم نے یہی کہنے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی دینی جماعتیں اور یہاں کے دینی ذہن رکھنے والے پڑھے لکھے لوگ ہماری اس بات پر غور کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے مجوزہ 'خاموش انقلاب' سے مکمل تبدیلی کے لیے راہ ہموار ہو سکتی ہے اور وہ اسلامی انقلاب بڑی حد تک آ سکتا ہے جس کے خواب دیکھتے ہماری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ لیکن کوئی سوچے تو! ہم نے تو اپنی سوچ پر پہرے بٹھا رکھے ہیں اور ہر آدمی اپنی بسم اللہ کے گنبد میں بند ہے اور اپنے اجتہادی لائحہ عمل کو 'عینِ دین' اور 'دین کی واحد تعبیر' ماننے اور منوانے پر مصر ہے۔

اللہ کرے ہماری یہ سطور کچھ دلوں اور دماغوں پر دستک دینے میں کامیاب ہو جائیں!

تزکیہ و تصوف مولانا محمد منظور نعمانی

کیا اوراد و اشغال بدعت اور خلافِ شریعت ہیں؟

۱۳۶۱ھ کے اواخر یا ۱۳۶۲ھ کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے مَیں دوچار ہوا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی جہاں دل و دماغ افکار و مکروہات سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہو۔ اس مقصد کے لیے میری نظرِ انتخاب اس زمانے کے ایک صاحبِ ارشاد بزرگ کی خانقاہ پر پڑی، جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے اور منظر بھی سرسبز و شاداب ہے۔ بہرحال! مَیں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے، از راہِ شفقت و کرم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا تھا۔ یاد آتا ہے کہ کوئی تیسرا شخص اُس وقت وہاں نہیں تھا۔ قریب ہی خانقاہ کی سہ دری میں چند ذاکر ''نفی اثبات'' کا اور بعض اُن میں سے ''اسم ذات'' کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔ اور مشائخِ سلوک کے تجویز کیے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔

اللہ کے ذکر میں جہر و ضرب کا یہ طریقہ اس وقت میرے لیے صرف نامانوس ہی نہ تھا، بلکہ کسی درجہ میں گویا ناقابل برداشت تھا، چنانچہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا: حضرت! ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے، اس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو رسول کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے اور جس کی تعلیم آپ نے صحابہ کرامؓ کو دی، اور پھر صحابہ کرامؓ سے بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل و روایت کے ذریعے جو اُن سے ہم تک پہنچا۔

اور یہ حضرات ذاکرین جس طرح جہری اور ضربی ذکر کر رہے ہیں جہاں تک اپنا علم ہے نہ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو یہ تعلیم فرمایا تھا، نہ صحابہ کرامؓ نے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کرایا اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو ہی یہ طریقہ بتلایا تھا اس لیے ذکر کے اس طریقے کے بارے میں مجھے خلجان ہے اور مَیں چاہتا ہوں کہ اگر میرا یہ خلجان کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اس

کی تصحیح ہوجائے۔

اُن بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں فرمایا: مولوی صاحب! یہ بے چارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں، یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں اس لیے میں اُن کو یہی بتلادیتا ہوں۔ آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تقریر وتحریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں۔

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا لیکن اُن بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مکرر توجہ دلانے کی مہلت دیے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور اُن کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرمادیا جو میرے لیے بھی دلچسپ تھا۔ ان کا رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اٹھانا مَیں نے بھی مناسب نہ سمجھا اور عشا کے قریب یہ مجلس ختم ہوگئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہوا کہ ذاکرین نے اُسی دھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کیا، مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور مَیں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا، لیکن آج بھی ان بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظرانداز فرماکر ہندوستانی مسلمانوں کی غالباً ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرمادیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

اُن بزرگ کے اس رویہ سے الحمدللہ مَیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا جواب ان کے پاس ہے نہیں، اس لیے یہ اس سے پہلوتہی کررہے ہیں، بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالباً میرے سوال کو ایک اہل اور طالب صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے، بلکہ ایک مبتلائے زعم وکبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظرانداز فرمایا جارہا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یاد ہے) مقصود بھی نہ تھی، بلکہ نیت کچھ اور ہی تھی۔

خانقاہ کے جس حجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نمازِ عشاء وغیرہ سے فارغ ہوکر مَیں اس میں جاکر لیٹ گیا اور تصوف کے اس قسم کے اعمال واشغال پر بطورِ خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور وفکر میں خود ہی سائل تھا اور خود ہی مجیب۔ یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث ومباحثہ میں دیر تک نیند

نہیں آئی۔ میں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یک سُو ہو جائے۔ اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اُس کی تصحیح ہو جائے، اور اگر میں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو پھر اس بارے میں مجھے ایسا یقین واطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا ردّ وانکار کروں اور ان باتوں کے غلط و باطل ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کروں۔

اسی غور وخوض میں کچھ دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال واشغال کو (مثلاً: ذکر ومراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کیے ہوئے ہیں اور اپنی قیود واوضاع کے ساتھ سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کا رواج دینے والا ماننا پڑے گا کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح اور تساہل ہی برتا، بلکہ ان کی تعلیم سے اُن کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر وشغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے؛ بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے، ان کتابوں کے پڑھنے والے اور حالات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلدی ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے، بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ وشاہ اسماعیل شہیدؒ جیسے اکابر علم ودین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے، اور وہ بھی ایک ایسے فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھر اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے لیے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ، ان کے شخصی حالات اور اصلاحی وتجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور عند اللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں اسرارِ دین کے عارف

اور امت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر اُن میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے رہے۔ بے شک مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحبِ وحی تو نہیں ہوتا لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروّج بھی نہیں ہوسکتا، خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہو، اور وہ اس کا خاص داعی ہو، اور اسی کے ذریعہ اصلاح وتجدید کا کام کر رہا ہو، اس میں اگر وہ بدعت وغیرہ میں امتیاز نہ کرسکے گا تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہوگا۔

بہر حال! یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی الجھن کچھ کم ہوئی اور مَیں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے، اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پالینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر مَیں نے اس غور وفکر کا سلسلہ اُس وقت ختم کر کے سوجانے کا ارادہ کرلیا اور سو گیا۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نمازِ فجر کے بعد چند میل ٹہلتے ہیں۔ اُس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہولیا اور رات کے اپنے ذہنی بحث ومباحثہ اور اُس کے نتیجہ کا ذکر کیا، اور عرض کیا: میرے دل ودماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوف کے ان اعمال واشغال کے بارے میں جواب تک مَیں نے سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے، لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں، چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔

موصوف میری یہ بات سن کر مسکرائے، اور فرمایا: مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلایئے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟

مَیں نے عرض کیا: بدعت کی تعریف تو علمائے کرام نے کئی طرح سے کی ہے، لیکن جو زیادہ منقح اور محقق معلوم ہوتی ہے، وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لیے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔

فرمایا: ہاں! ٹھیک ہے، لیکن یہ بتلایئے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ ورسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے

وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو جس طریقے سے کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں حاصل ہوجایا کرتی تھی، بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ ''دین میں اضافہ'' اور ''بدعت'' کہیں گے؟ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے فرمایا:) مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے اور دین میں اس کا نہایت ہی تاکیدی حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں اس کے لیے صرف صحبت کافی ہوجاتی تھی، تعلیم کے لیے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا، نہ مدرسے تھے، نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہوگئے کہ صحبت اس مقصد کے لیے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی، تو اللہ تعالیٰ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کیے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم وتعلّم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے، تو کیا تعلیم وتعلّم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی ''دین میں اضافہ'' اور بدعت کہا جائے گا؟

مَیں نے عرض کیا: نہیں! ''دین میں اضافہ'' جب ہوتا ہے جب کہ مقصود اور امرِ شرعی بنا کر کیا جائے، لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے قدیمی طریقے کے ناکافی ہوجانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کرلیا جائے تو اس کو ''دین میں اضافہ'' نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔

فرمایا: بس سلوک کے جن اعمال واشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے، ان سب کی نوعیت بھی یہی ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تحلیہ کے لیے کرایا جاتا ہے، جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے۔ مثلاً یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اس کی رضا کا دھیان، فکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں۔ اور قرآن وحدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن رسول کریم ﷺ کے زمانے میں دین کے لیے تعلیم وتربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہوجاتی تھیں اور آنحضرت ﷺ کے فیضانِ صحبت سے صحابہ کرامؓ کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی۔ لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہوجانے کی وجہ سے اس مقصد کے لیے کاملین کی صحبت بھی

کافی نہیں رہی، تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لیے صحبت کے ساتھ ''ذکر وفکر کی کثرت'' کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے ان کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لیے ان کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کیے۔ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لیے اور طبیعت میں رقت اور یک سوئی پیدا کرنے کے لیے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہے، تو اُن میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا، بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اور اسی لیے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانے کے حالات اور اپنے اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں ردّ و بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لیے ان کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال واشغال تجویز کر دیتا ہے۔ اور بعض ایسی علمی استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنہیں اس طرح کا کوئی ذکر شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کیا کرایا جاتا ہے۔

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی خلجان تو دور ہو گیا، لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہو گئی کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو خود آزما کے دیکھا جائے اور اپنے ذاتی تجربے سے قلبی اطمینان اور مزید یقین حاصل کیا جائے۔ لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربے کے لیے مَیں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں۔ اس لیے مَیں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا: اگر یہ ذکر و شغل ان مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر تو مَیں بھی اس کا محتاج ہوں لیکن مَیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رکھا ہے، ان کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔

فرمایا: مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لیے نہیں، بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے اور جان پڑتی ہے، لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ کی مشیت ہے، جن کو اللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ بھی

وہ ادھر دے دیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے، باوا صاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ، حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا، (جن کا سوواں اور ہزاروں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہ کر سکیں) اس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستے سے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بے چارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی اہل ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں۔ ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا: خدا معلوم! لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں۔ تصوف تو بس صرف اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہوسکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے، بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہوجائے تو مبارک ہے، وہ اسی راستے سے حاصل کرلے اور ہم کو بھی بتلادے۔ ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سیکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے، جن میں سیکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحبِ الہام بھی تھے۔

مَیں نے عرض کیا: جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو اور وہ یہ محسوس کرتا ہو کہ اسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے تو کیا وہ کسی مدت تک اس کام کو چھوڑ کر پہلے اس کی تحصیل کرے، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو کچھ وہ کررہا ہے اس کو بھی کرتا رہے اور اس کے ساتھ اس کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے؟

فرمایا: ہاں! ہوسکتا ہے، البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں کچھ مدت کے لیے یک سُوئی کے ساتھ اسی طرف مشغول ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے عرض کیا: کیا اس کے لیے بیعت ہونا بھی ضروری ہے؟

فرمایا: نہیں! بالکل نہیں! ہاں طلب اور اعتماد کے ساتھ محبت اور صحبت ضروری ہے۔ بیعت تو

صرف تعلق اور اعتماد کے اظہار کے لیے ہے، ورنہ اصل مقصد میں بیعت کو کوئی خاص دخل نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا: پھر مجھ کو بھی کچھ فرما دیں۔

فرمایا: مولوی صاحب! حدیث میں ہے: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" (جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس کو پوری دیانت داری سے مشورہ دینا چاہیے) میں آپ کے لیے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ اس مقصد کے لیے فلاں صاحب یا فلاں صاحب کی طرف رجوع کریں، ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے اور آپ جیسے علم والوں کے لیے مَیں ان ہی حضرات کو اہل سمجھتا ہوں۔

مَیں نے عرض کیا: ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے بھی کچھ دل میں تھی اور اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہوگئی ہے، لیکن چونکہ مجھ میں یہ طلب نہیں پیدا ہوئی ہے، اس لیے مَیں تو اس راستے میں حضرت ہی سے راہنمائی حاصل کرنا اپنے لیے بہتر سمجھتا ہوں۔

موصوف نے اپنی محبت وشفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یا دو دفعہ پھر ان ہی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا، لیکن جب مَیں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمالیا اور میری مصروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرما دیا اور مَیں نے کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد مَیں غالباً چار پانچ دن وہاں اور مقیم رہا۔ جب اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا: حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد الیاسؒ) کی خدمت میں آپ ضرور جایا کریں اور کچھ قیام کیا کریں۔ اس موقع پر مولانا موصوفؒ کے متعلق چند بہت بلند کلمات بھی ارشاد فرمائے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورے کی تعمیل پر آمادہ کیا اور جیسا کہ مولانا مرحومؒ کے ملفوظات کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد ہی مَیں نے مولانا موصوفؒ کی شخصیت کو کچھ جانا اور کچھ عرصے کے بعد مَیں یہ بھی سمجھ سکا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہیت اور خانقاہی مشاغل اور اہل خانقاہ سے مجھے جو بُعد تھا، اس میں اچھا خاصا دخل میرے احساس کو بھی تھا کہ ان حلقوں میں دین کی فکر اور اس کی خدمت کا جوش مَیں

کم پاتا تھا، حالانکہ میں اس کو رسول ﷺ کی خاص میراث سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر اس کی اصلاح وتعدیل کے لیے ہی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری اور قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے تاکید فرمائی گویا مجھے ایک عشق باز اور صاحبِ اخلاص بندے کے دین کے درد اور اس راہ میں اس کی تڑپ اور بے کلی کا مشاہدہ کرانا تھا اور دکھانا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد

یہ آٹھ نو برس پہلے کا واقعہ ہے۔ حافظہ نے اب تک جتنا کچھ محفوظ رکھا لکھ دیا ہے، اپنی اور اُن بزرگ کی گفتگو کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ان سب کو روایت بالمعنی ہی میں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ کی بعض باتیں رہ گئی ہوں اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں جو اس موضوع پر بعد میں کسی اور صحبت میں ان بزرگ سے سنی گئی ہوں۔ بہر حال جو توضیحات وتشریحات اُن بزرگ کی طرف منسوب کر کے یہاں لکھی گئی ہیں، اس کا اطمینان ہے کہ وہ سب انہی کی ہیں۔

تصوف کے اعمال واشغال کے متعلق جس ذاتی تجربہ کا ارادہ کیا گیا تھا افسوس ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا ابالی پن کی وجہ سے اور کچھ اپنے دیگر مشاغل کی کثرت اور خاص نوعیت کے سبب سے کما حقہ وہ تجربہ تو نہیں کیا جاسکا، تاہم جو ٹوٹا پھوٹا اور برائے نام سا تعلق اس سلسلے سے اور اس کے اشغال سے ان چند سالوں میں رہا اور اس کی وجہ سے اس راہ کے بعض اکابر سے جو قرب حاصل رہا اور ان کے احوال اور ماحول کو قریب سے مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا، اس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تصوف کے مخالفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں بعض خود اہل تصوف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں۔

خدا لگتی بات یہ ہے کہ غریب ''تصوف'' اپنے منکروں اور مخالفوں کا تو مظلوم ہے ہی لیکن جو اس کے حامل اور علمبردار ہیں کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس مظلومیت کا باعث بن رہی ہیں۔

تزکیۂ نفس

مدیر

رمضان المبارک ہمیں بدلتا کیوں نہیں؟

کون نہیں جانتا؟

❁ کون سا مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ نماز ضروری ہے۔ پھر ہم میں سے کتنے ہیں جو باقاعدگی سے باجماعت نماز پڑھتے ہیں؟ **شاید 10 فی صد**

❁ کون سا مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو اس نے ہماری ہدایت کے لیے نازل کی ہے۔ اس کے باوجود ہم میں سے کتنے ہیں جو قرآن کی عربی عبارت کو پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں؟ **شاید 1 فی صد**

❁ ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ تہجد تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے باوجود ہم میں سے کتنے ہیں جو باقاعدگی سے تہجد پڑھتے ہیں؟ **شاید 0.1 فی صد**

❁ ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں لیلۃ القدر مل جاتی ہے جس کی عبادت ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل ہے۔ اس کے باوجود ہم میں سے کتنے ہیں جو یہ پانچ راتیں عبادت میں جاگ کر گزارتے ہیں؟ **شاید 0.01 فی صد**

❁ ہم میں سے کتنے ہیں جو مندرجہ بالا باتوں کے لیے فکر مند ہیں؟ اور ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کے لیے کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کی یہ حالت بدل جائے اور وہ بہتر مسلمان بن جائیں؟

شاید 0.001 فی صد

آخر ہم کیوں نہیں سوچتے؟ ہم کیوں نہیں کچھ کرتے؟

تفہیم مغرب　　عبداللہ میر

مغربیات۔حسنِ عقیدت وتنقید

❁ احمد جاوید صاحب چونکہ فلسفی اور ادیب ہیں لہٰذا مغرب پر ان کی تنقید خوب ہوتی ہے۔تاہم اگر آپ اس سے نتیجہ نکالنا چاہیں تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ انہوں نے مغرب کی مدح کی ہے یا اس پر نقد۔ (احمد جاوید صاحب کا ایک محب)

❁ سید خالد جامعی صاحب کے علم وفضل پر کس کافر کو شک ہوسکتا ہے لیکن وہ اسلوبِ رازی کے اتنے اسیر ہیں کہ مغربی تہذیب کے ردّ میں جب سوالات تراشتے ہیں تو مزہ آجاتا ہے لیکن ان کا جواب اتنا طویل اور غیر مرتب ہوتا ہے کہ کچھ پلے نہیں پڑتا۔

(خالد جامعی صاحب کا ایک مداح)

❁ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جب قلم اٹھاتے ہیں تو آدمی عش عش کر اٹھتا ہے لیکن جماعت اسلامی اور فکر مودودی پر ان کی تنقید اتنی بچگانہ ہوتی ہے کہ آدمی پریشان ہوجاتا ہے۔ (ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کا ایک محب)

❁ عمار ناصر صاحب کا تجدد تو واضح ہے لیکن ان کے والد گرامی مولانا زاہد الراشدی صاحب مغرب اور اسلام کو اس طرح ملا جلا کر چلتے ہیں کہ سمجھ نہیں آتی کہ وہ مغربی فکر وتہذیب کو مطابقِ اسلام ثابت کررہے ہیں یا اسلام پر مغرب کا چولا فٹ کررہے ہیں۔

(یکے از محبان مولانا زاہد الراشدی)

❁ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے مغربی تہذیب پر جو لکھا ہے، اس میں نہ تو علمی گہرائی ہے نہ مغربی مآخذ سے استفادہ۔تاہم ان کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے اور عام آدمی اسے بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ (ڈاکٹر محمد امین کی تحریروں کا ایک مداح)

استفسارات مدیر

اقامتِ دین کا مفہوم

ایک قاری نے پوچھا ہے کہ آپ کے نزدیک 'اقامتِ دین' کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

عرض ہے کہ 'اقامتِ دین' قرآن وسنت کی یا مسلم علمی روایت کی کوئی اصطلاح نہیں ہے جس کا لغت سے ہٹ کر کوئی مفہوم ہو۔ 'اقامتِ دین' کا مطلب ہے دین کو قائم کرنا جیسے اقامت صلوٰۃ کا مطلب ہے نماز قائم کرنا۔ یعنی نماز ادا کرنا۔ ظاہر ہے جب تک نماز ادا نہ کی جائے گی وہ قائم نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح دین قائم کرنے کا مطلب ہے دین پر عمل کرنا اور چونکہ ہمیں سارے دین پر عمل کا حکم دیا گیا ہے "ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً" [البقرہ ۲:۲۰۸] لہٰذا اقامت دین کا مطلب ہے زندگی کے ہر شعبے میں دین پر عمل کرنا یعنی ذاتی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ اجتماعی زندگی عبارت ہے معاشرے اور ریاست وحکومت سے۔ گویا فرد کا سارے دین پر عمل کرنا ضروری ہے خواہ اس کی ذاتی زندگی ہو جیسے نماز، روزہ، تلاوت، ذکر وغیرہ یا معاشرے اور ریاست وحکومت میں اس کا کردار ہو، ہر جگہ دین کی تعلیمات پر عمل ضروری ہے۔

معاشرے اور ریاست وحکومت کا بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے جو ظاہر ہے افراد ہی کریں گے کیونکہ معاشرہ اور ریاست وحکومت افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے اور معاشرے اور ریاست وحکومت کو افراد ہی چلاتے ہیں۔

اگر مسلم فرد اپنی ذاتی زندگی میں یا اپنے معاشرتی وحکومتی کردار میں دین پر عمل نہ کرے تو ختم نبوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو (یعنی ان کے حکام کو، علماء کو، ہر ذمہ دار کو اور ہر مسلمان کو) امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اصلاح کا حکم دیا ہے جس کے اہم عناصر تعلیم وتربیت، تبلیغ، دعوت اور تزکیہ ہیں۔ اللہ کرے یہ اختصار مخل فہم نہ ہو۔

دلِ زُود رنج نہ کر گلہ

تجھے کیا خبر میرے بے خبر میرا سلسلہ کوئی اور ہے
جو مجھی کو مجھ سے بہم کرے وہ گریز پا کوئی اور ہے

مرے موسموں کے بھی طور تھے مرے برگ و بار ہی اور تھے
مگر اب روش ہے الگ کوئی مگر اب ہوا کوئی اور ہے

یہی شہر شہرِ قرار ہے تو دلِ شکستہ کی خیر ہو
مری آس ہے کسی اور سے مجھے پوچھتا کوئی اور ہے

یہ وہ ماجرائے فراق ہے جو محبتوں پہ نہ کُھل سکا
کہ محبتوں ہی کے درمیاں سببِ جفا کوئی اور ہے

ہیں محبتوں کی امانتیں ، یہی ہجرتیں یہی قربتیں
دیے بام و در کسی اور نے تو رہا بسا کوئی اور ہے

یہ فضا کے رنگ کھلے کھلے اسی پیش و پس کے ہیں سلسلے
ابھی خوش نوا کوئی اور تھا ابھی پَر کُشا کوئی اور ہے

دلِ زُود رنج نہ کر گلہ کسی گرم و سردِ رقیب کا
رخِ ناسزا تو ہے روبرو پسِ ناسزا کوئی اور ہے

بہت آئے ہمدم و چارہ گر جو نمود و نام کے ہو گئے
جو زوالِ غم کا بھی غم کرے وہ خوش آشنا کوئی اور ہے

یہ نصیرؔ شامِ سپردگی کی اُداس اُداس سی روشنی
بکنارِ گل ذرا دیکھنا یہ تمہی ہو یا کوئی اور ہے

نصیر ترابی

CPL No. 296 May 2021

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

خاموش انقلاب ناگزیر ہے

ریاست اگر ساتھ نہ بھی دے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی
میں اسّی فیصد سے زیادہ اسلام پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

صفحات ۲۸۸ قیمت ۲۵۰ روپے

مکتبہ البرہان

97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com